ماہنامہ لاہور

میثاق

اپریل ۷۹ء

بمو قع چھٹی سالانہ

قرآن کانفرنس

آئی ۔ بی ۔ اے ۔ اڈیٹوریم کراچی ۲۲ تا ۲۴ مارچ ۷۹ء

زیر اہتمام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدر مؤسس

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ چندہ -/۲۰ — اس شمارے کی قیمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

تقدیم

'میثاق' کا گذشتہ ماہ کا شمارہ قدرے تاخیر سے شائع ہوا تھا جس کا سبب راقم الحروف کی وہ غیر معمولی مصروفیت تھی جس کا ایک اجمالی خاکہ گذشتہ ماہ کے 'عرضِ احوال' میں پیش بھی کر دیا گیا تھا ـــــ اب یہ شمارہ کسی قدر 'پیشگی' شائع ہو رہا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ۲۲ تا ۲۴ مارچ میں مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی چھٹی سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہو رہی ہے ـــــ اور اِس موقع پر ایک فرض کی ادائیگی ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں ـــــ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ گذشتہ سال بھی مارچ ہی کے مہینے میں ٹھیک اِنہی تاریخوں میں اور عین اِسی مقام پر (آئی۔ بی۔ اے، آڈیٹوریم، کراچی ؛) پانچویں سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تھی اُس میں جو مقالات پیش کئے گئے تھے وہ سب کے سب 'میثاق' کی اشاعتِ خصوصی بابت نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہو چکے ہیں، سوائے ایک مقالے کے جس کی اشاعت ابھی باقی تھی یعنی محترم ڈاکٹر بشارت علی صاحب کا مقالہ "عمومانیاتِ تاریخ : قرآنِ حکیم کی روشنی میں" ـــــ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ 'میثاق' کی اپریل ۱۹۷۹ء کی اشاعت ذرا جلد طبع ہو جائے اور اُس میں مذکورہ مقالہ شامل کر دیا جائے: تاکہ پچھلی کانفرنس کا مقالہ کم از کم اِس کانفرنس کے موقع پر تو شائع ہو ہی جائے ـــــ اگر اللہ کو منظور ہوا، اور پریس اور دفتری وغیرہ کی جانب سے کوئی تاخیر نہ ہوئی تو ہم اس قرض کے بوجھ سے بالکل بروقت نہ سہی تب بھی کسی نہ کسی حد تک معقول مُدّت کے اندر اندر بری ہو جائیں گے ؛

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کانفرنس کو سابقہ کانفرنسوں سے بھی زیادہ کامیاب و کامران فرمائے، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيۡزٍ۔

خاکسار : اِسرار احمد عفی عنہ

(نوٹ : فہرست مضامین کور کے آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

تفسیر سُورۃ انفال

سُورۃ انفال کی آیات ۱۱ تا ۱۹ کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تین نشری تقاریر جو ماہ مارچ ۷۹ء کے پہلے تین جمعوں کی صُبح

ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئیں

اَحْمَدُہٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ، اَمَّا بَعْدُ ، فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنْہُ وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَہِّرَکُمْ بِہٖ وَیُذْہِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ وَیُثَبِّتَ بِہِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْہُمْ کُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمْ شَآقُّوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِکُمْ فَذُوْقُوْہُ وَاَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝ ـــــ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

یہ سورۂ انفال کی آیات ۱۱ تا ۱۴ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"یاد کرو جب کہ اللہ طاری کر رہا تھا تم پر غنودگی اپنی جانب سے اطمینان کا ذریعہ بنا کر، اور نازل فرما رہا تھا تم پر آسمان سے پانی تاکہ پاک کرے تمہیں اور دُور کر دے تم سے شیطان کی گندگی کو، اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو، اور خوب جما دے اس کے ذریعے تمہارے قدموں کو ـــ جب کہ اشارہ فرما رہا تھا تیرا ربّ فرشتوں کو کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ مَیں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔ پس ضرب لگاؤ اُن کی گردنوں کے اوپر اور ضرب لگاؤ ان کی ایک ایک پور پر۔ یہ اس لئے کہ

یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقابلے پر آئے ہیں اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کا مقابلہ کرے اُس کے حق میں اللہ سخت پاداش والا ہے۔ لو اس سزا کا مزہ تو فوری طور پر چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کا اصل حق عذابِ جہنم ہے!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں اُس نصرتِ خداوندی اور تائیدِ غیبی کی تفصیل بیان ہوئی ہے جو میدانِ بدر میں اہلِ ایمان کو حاصل ہوئی ہے۔ اور جس کا پیشگی وعدہ آیات ۹، ۱۰ کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو چکا تھا۔ اس نصرت و تائید کے دو رُخ ہیں، ایک ظاہری یعنی عالمِ محسوسات میں اور دوسرا باطنی یعنی غیر مرئی عالم میں۔ ظاہری نصرت بھی دو صورتوں میں ہوئی۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر ایک ایسی اونگھ طاری کر دی جس سے اُن کے دلوں سے خوف اور اندیشہ زائل ہو گیا اور اطمینان اور سکون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بارشِ برسا دی جس سے اہلِ ایمان کو نہ صرف پینے کے لئے بلکہ طہارت اور غسل اور وضو کی جملہ ضروریات کے لئے وافر مقدار میں پانی میسّر آ گیا ——— اس مقام پر جس نیند کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد جنگ سے پہلے والی رات کے دوران پُرسکون نیند ہے جس سے اہلِ ایمان کی سفر وغیرہ کی تکان زائل ہو گئی اور وہ اگلے دن کے معرکے کیلئے پوری طرح تازہ دم اور چاق و چوبند ہو گئے اور اسے اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی طرف اس لئے منسوب فرمایا کہ بظاہر احوال تو آنے والا دن شدید خطروں اور اندیشوں کے جلو میں آ رہا تھا اور قلّتِ تعداد اور اسلحہ و ساز و سامان کی کمی کے پیشِ نظر شیطانی وساوس کا ہجوم بالکل قرینِ قیاس تھا۔ اس حال میں اللہ کی عنایتِ خصوصی ہی سے دلوں کو وہ اطمینان اور سکون نصیب ہو سکتا تھا کہ انسان بے کھٹکے سو سکے۔ یہ توجیہ یقیناً قابلِ بھی ہے اور ہر طرح قرینِ عقل بھی ——— لیکن وہ دوسری توجیہ بھی جس کی جانب سلف کی اکثریت کا رُجحان ہے ہرگز خلافِ عقل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض متجدّدین کا خیال ہے۔ اِس توجیہ کی رُو سے یہ صورت عین جنگ کے دوران پیش آئی، کہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے اہلِ ایمان کے دلوں میں اِس درجہ بے خوفی اور امن و سکون کی کیفیت پیدا ہو گئی کہ عین میدانِ جنگ میں ان پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی جو بظاہر بڑی مضحکہ خیز نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے دوران ہر وقت پوری فوج نہیں لڑ رہی ہوتی بلکہ مختلف اوقات میں مختلف دستے مصروفِ پیکار ہوتے

ہیں اور بقیہ فوج حالتِ انتظار میں ہوتی ہے اور ایسے لوگوں پر اس کیفیت کا طاری ہوجانا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے، اور یہ یقیناً بے خوفی اور اطمینان و سکونِ قلبی کی علامت ہے اور عنایتِ خداوندی اور تائیدِ ایزدی کا مظہر ہے، لہٰذا یہ توجیہہ نہ مضحکہ خیز ہے نہ خلافِ عقل!

اسی طرح بدر کے دن علی الصبح بارانِ رحمت کا نزول بھی مسلمانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نصرتِ خصوصی کا مظہر ہے۔ میدانِ بدر میں لشکرِ کفار پہلے پہنچا تھا اور اس نے پانی کے کنوئیں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسلمان بعد میں پہنچے اور پانی کا حصول اُن کے لئے ایک پریشان کُن مسئلہ بن گیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے شب میں بارش نازل ہوگئی جس کا پانی اہلِ ایمان نے حوض بنا کر محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح نہ صرف یہ کہ تین سو تیرہ النسانوں ستّر اونٹوں اور دو گھوڑوں کے پینے کے لئے پانی مہیا ہوگیا بلکہ طہارت اور غسل و وضو کے ضمن میں بھی کوئی دشواری نہ رہی جس کی جانب خصوصی اشارہ ہے: "لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ" کے الفاظِ مبارکہ میں یعنی (تاکہ اللہ پاک کرے تمھیں اُس کے ذریعے!) ــــــ اگلے الفاظ یعنی: "وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ!" سے اسی کی تاکید مزید بھی مراد ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ذریعے اشارہ ہو شیطانی وساوس کے ازالے کی جانب اس لئے کہ ناپاکی کی حالت میں شیطانی وسوسوں کا زور بہت بڑھ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۶، ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ کی درمیانی شب کو میدانِ بدر میں نازل ہونے والی بارش کے بارے میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ تاریخ انسانی کے رُخ کے اعتبار سے کس درجہ مؤثر اور فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ جس طرح مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اگر ۱۷ر اور ۱۸ر جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی شب کو واٹرلو میں بارش نہ ہوتی تو یورپ کا پورا سیاسی نقشہ بدل جاتا اس لئے کہ اس صورت میں نپولین کو میدانِ جنگ کے خشک ہونے کے انتظار میں جنگ کو دوپہر تک ملتوی نہ کرنا پڑتا اور فریقِ مخالف کو کمک پہنچنے سے پہلے پہلے مقابلہ ہوجاتا تو اس کی فتح یقینی تھی۔ اسی طرح کچھ نہیں کہا جاسکتا

---

[1] حضرتِ حفیظ جالندھری نے "شاہنامۂ اسلام" کی دوسری جلد میں بارانِ رحمت کے اس نزول کے ضمن میں: "صحرا کی دُعا" کے عنوان سے جو اشعار لکھے ہیں وہ بلاشبہ نہایت اعلیٰ تخیل کے آئینہ دار ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے انہیں اس شمارے میں کسی دوسرے مقام پر شائع کیا جا رہا ہے۔ (مُدیر)

کہ اگر بدر میں بارش نہ ہوتی تو سعادت و شقاوتِ انسانی کا نقشہ کیا صورت اختیار کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی انعامات میں سے شمار کیا ہے ؎

بہرحال نصرتِ خداوندی اور تائیدِ ایزدی کی ان دونوں ظاہری صورتوں یعنی اطمینان بخش غنودگی کے طاری ہونے اور بارش کے نزول کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے دل بھی مضبوط ہو گئے اور قدم بھی جم گئے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ط" ؎

اللہ کی باطنی نصرت کا ظہور فرشتوں کے نزول کی صورت میں ہوا، اور اس کے ضمن میں بھی توجیہ و تاویل کا ایک اختلاف پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ آیا فرشتوں نے خود بھی جنگ میں باضابطہ حصّہ لیا اور کفّار کو خود قتل کیا۔ یا وہ صرف اہلِ ایمان کی تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بنے! تو اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل فیصلہ کُن چیز دلوں اور قدموں کا جماؤ ہی ہے اور اگر کسی فوج کو تائیدِ ایزدی اور نصرتِ غیبی سے یہ کیفیات حاصل ہو جائیں تو یہی حصولِ فتح کی کافی ضمانت ہیں لیکن الفاظِ قرآنی کا سیاق و سباق جہاں "ثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا" کو مقدّم رکھ رہا ہے اور اس طرح اُس کی اہمیّت کی جانب اشارہ کر رہا ہے، وہاں اگر خواہ مخواہ کی تاویل سے کام نہ لیا جائے تو صاف واضح کر رہا ہے کہ "فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ" کے حکم کے مخاطبِ اوّل ملائکہ ہی ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگِ بدر میں ملائکہ کا نزول صرف اہلِ ایمان کی تثبیتِ قلبی کے لئے نہیں ہوا بلکہ انہوں نے خود بھی جنگ میں شرکت کی اور کفّار کو قتل کیا۔ چنانچہ اسی کی تائید حدیث اور سیرت کی بہت سی روایات سے ہوتی ہے ؎

فرشتوں کو اس موقع پر جو فرمانِ الٰہی ملا اُس کا آغاز "أَنِّي مَعَكُمْ" کے الفاظ سے ہوا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے اِذن اور اُس کی تائید کے بغیر فرشتے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ اِس قسم کی تصریحات سے قرآن پاک شرک کا راستہ بند کرتا ہے، ورنہ ذرا سی غلطی سے ایمان بالملائکہ بگڑ کر دیویوں اور دیوتاؤں کے مشرکانہ تصوّرات کی صورت اختیار کر سکتا ہے ؎

کافروں کے دلوں میں رعب ڈالنے کے ضمن میں "سَأُلْقِي" کا اسلوب اختیار کیا گیا جس سے اشارہ ہوا کہ اللہ کی نصرت ابتداءً نہیں آتی بلکہ اہلِ ایمان

کی جانب سے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے مظاہرے کے بعد آتی ہے ـــــ اسی لئے اسے مستقبل کے صیغے سے بیان فرمایا گیا۔ یعنی: "میں عنقریب ڈال دوں گا ان کے دلوں میں رُعب!" ـــــ: "ضرب لگاؤ اُن کی گردنوں کے اوپر اور ضرب لگاؤ اُن کی ایک ایک پور پر!" کے الفاظ سے کفّار و مشرکین کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے اُن کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہوں کہ فرشتے اور اہلِ ایمان جہاں چاہیں آزادانہ ضرب لگائیں اور یہ کیفیت فی الواقع پیدا ہو جاتی ہے، اُن لوگوں میں جن کے دلوں میں رعب بیٹھ گیا ہو اور ہیبت طاری ہو گئی ہو کہ ان کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں اور وہ فریقِ مخالف کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں کہ جس طرح چاہے اُن کا قیمہ بنا ڈالے۔ ؛

آخر میں اس پوری صورتِ حال کا سبب بیان ہوا کہ اُن کا یہ حشر اس لئے ہوا کہ وہ بڑے فخر و غرور اور دبدبے اور طنطنے کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے پر آئے تھے اور جو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے پر آئے، اس کے حق میں اللہ بہت سخت ہے۔ ؛

آخری آیت میں رُوئے سخن کُفّارِ مکّہ کی جانب ہے کہ لو! بدر کی اس شکستِ فاش کی صورت میں عذابِ خُداوندی کی یہ پہلی قسط تو نقد وصول کر لو، اور آئندہ اس سے شدید تر سزاؤں کے لئے تیار رہو ـــــ اور حقیقتاً دُنیا کی تو کوئی سزا بھی تمہارے جرم کے برابر نہیں ہو سکتی۔ تمہارے کفر و اعراض اور اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت و عداوت ایسے عظیم جرائم کی بھرپور سزا تو صرف دوزخ کی آگ ہے جو تمہارے لئے بالکل محفوظ ہے ؛ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ ط

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۲)

اَحْمَدُهٗ وَاُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ۝ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ـــ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ : صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ۝

یہ سورۂ انفال کی آیات ۱۵ تا ۱۶ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

" اے ایمان والو! جب کبھی کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ باقاعدہ فوج کشی کی صورت میں ہو تو ہرگز انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور جو کوئی اُن کو پیٹھ دکھلائے گا سوائے اِس کے کہ جنگی چال کے طور پہ پینترا بدلنا مقصود ہو یا کسی دوسرے گروہ سے جا ملنا مطلوب ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو قتال فی سبیل اللہ کے موقع پہ کفّار کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کا تاکیدی حکم بھی ہوا ہے اور اس کی خلاف ورزی پہ شدید سزا کی وعید بھی وارد ہوئی ہے۔

واضح رہنا چاہیئے کہ اسلام صرف عام معنوں میں ایک مذہب ہی نہیں ہے جو صرف دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت یا تزکیہ و تربیت پہ اکتفا کرتا ہو بلکہ وہ ایک مکمّل دین ہے جو پوری انسانی زندگی کو جُملہ انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں سمیت اپنے حیطۂ اقتدار میں لینا چاہتا ہے۔ اور یہ وہ مقصد ہے جس کے حُصول کے لئے جلد یا بدیر باطل کی قوّتوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا ہے اور بالآخر مُسلّح تصادم کی نوبت بھی آکر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم جہاد یعنی باطل سے کشمکش کو تو ایمان کا عین لازمی اور ناگزیر نتیجہ قرار دیتا ہے بمصداقِ الفاظِ قرآنی : اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحجرات آیت : ۱۵) یعنی ["حقیقی مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پہ ایمان لائیں بایں طور کہ شک باقی نہ رہے، اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سمیت، بس یہی لوگ سچے ہیں!"] ❖

رہا قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں نقدِ جان ہتھیلی پہ رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جانا تو قرآن کی رُو سے یہ اسلام کے نظامِ حکمت و اخلاق میں بلند ترین نیکی یعنی "SUMMUM BONUM" یا خیرِ اعلیٰ یعنی "HIGHEST VIRTUE" ہے بمصداقِ الفاظِ قرآنی : اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (سورۂ صف آیت ۴) یعنی [اللہ تو محبوب رکھتا ہے انہیں جو لس

کی راہ میں جنگ کریں ایسے صف بستہ ہو کر گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں !] ؛

آیاتِ زیرِ درس میں یہی بات منفی اسلوب میں ادا کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ جان بچانے کی خاطر میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ایسے شخص کو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں جان و مال زیادہ عزیز ہیں، اور آخرت کے مقابلے میں دُنیا محبوب تر ہے۔ گویا ایمان کا دعویٰ صرف زبانی اقرار تک محدود ہے۔ دل نورِ ایمان سے خالی اور دولتِ یقین سے محروم ہے ــــ لہٰذا ایسا شخص عذابِ خداوندی کا مستحق ہے اور اس کا اصل مقام جہنّم ہے ــــ جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے !! ؛

آیاتِ زیرِ درس قرآنِ حکیم کی فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اختصار کی ایک نہایت اعلیٰ اور درخشاں مثال ہیں، اِس لئے کہ چند گنے چُنے الفاظ میں جہاں وعید کا پہلو پوری شدّت کے ساتھ نمایاں ہو گیا ہے، وہاں استثناء کی جملہ صورتوں کا بھی حد درجہ جامعیّت کے ساتھ احاطہ ہو گیا ــــ اس ضمن میں سب سے پہلا قابلِ توجّہ لفظ "زحف" ہے۔ جس کے لغوی معنی پاؤں گھسیٹ کر آہستہ آہستہ چلنے کے ہیں جیسے وہ شخص چلتا ہے جس پر بہت بوجھ لدا ہوا ہو۔ اس سے یہاں مراد باقاعدہ فوج کشی ہے جس سے حکمِ وعید صرف باقاعدہ فوج کشی کی صورت سے متعلق رہ گیا اور چھاپہ مار دستوں کا معاملہ اس سے خود بخود خارج ہو گیا۔ اس لئے کہ باقاعدہ فوج کشی، اور چھاپہ مار جنگ کے مابین فرق و تفاوت زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ چھاپہ مار جنگ کا تو اصول ہی یہ ہے کہ غنیم پر اچانک حملہ کیا جائے اور اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پسپائی اختیار کر لی جائے اس سے پہلے پہلے کہ وہ سنبھل کر جوابی وار کر سکے ــــ دورِ جدید میں COMMANDO's کا طریقِ جنگ اور گوریلا WARFARE اسی کی ارتقاء یافتہ و منظم اور پوری دُنیا میں مسلّم صورتیں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس طریقِ جنگ میں تو جملہ کے بعد فوری پسپائی اس کے عین مزاج اور بنیادی اصول کی حیثیّت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ صورت آیاتِ زیرِ درس میں وارد شدہ وعید سے مستثنیٰ ہے۔ باقاعدہ فوج کشی کے لئے "زحف" کے لفظ کا استعمال بھی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے اس لئے کہ چھاپہ مار دستے اپنے مفوّضہ فرائض کی مناسبت سے ہلکے پھلکے سامان سے لیس ہوتے ہیں تاکہ اُن کی تیزی سے حرکت کرنے کی صلاحیّت یعنی MOBILITY برقرار رہے اور اس میں

بوجھل سامان رکاوٹ نہ بنے۔ جبکہ باقاعدہ فوج جب حرکت کرتی ہے تو پورے ساز و سامان کے ساتھ اور رسد وغیرہ کے پورے بندوبست کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رفتار سُست ہوتی ہے، اور یہی لفظ "زحف" کا اصل مفہوم ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حیاتِ نبویؐ کے دوران پہلی باقاعدہ جنگ میدانِ بدر میں ہوئی اس سے قبل آنحضورؐ چھاپہ مار دستے روانہ فرماتے رہے تھے، جن کا مقصد قریش کے تجارتی راستوں کو مخدوش بنانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ وعید پہلے نازل نہیں ہوئی، بلکہ غزوۂ بدر کے موقع پر نازل ہوئی۔

باقاعدہ فوج کشی اور باضابطہ جنگ کی صورت میں بھی دو قسم کی پسپائیوں کو اس مقام پر وارد شدہ وعید سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یعنی وہ پسپائی جو مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ ہو یا مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ ـــــ 'حرف' کہتے ہیں ایک کنارے، ایک جانب یا ایک پہلو کو۔ گویا متحرف وہ شخص ہے جو ایک طرف یا ایک کنارے کی جانب ہو جائے۔ اور اس میں مکمل تصویر ہے اس شخص کی جو کسی دو بدو مقابلے میں دشمن کے وار کو خالی کر دینے کے لئے پینترا بدل کر ایک جانب کو ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں کبھی بالکل گھوم جانا بھی ہو سکتا ہے اور اُس کے دوران ایک بار پیٹھ بھی غنیم کی جانب ہو سکتی ہے ـــــ لیکن اس میں اصل مقصد گھوم کر وار کرنا اور مقابلہ جاری رکھنا ہوتا ہے نہ کہ جان بچا کر بھاگ جانا جسے محاورہ میں پیٹھ دکھانا کہتے ہیں ـــــ بالکل اسی طرح کبھی پوری فوج کی نقل و حرکت بھی کسی فوری جنگی چال کے پیشِ نظر ایسی نوعیت کی ہو سکتی ہے کہ جو بظاہر پسپائی بلکہ فرار نظر آئے۔ لیکن اگر یہ پسپائی پورے نظم و ضبط کے ساتھ سپہ سالار کے فرمان کے مطابق اور جنگ جاری رکھنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ہو اور اس میں جان بچا کر بھاگ جانا پیشِ نظر نہ ہو تو فطری طور پر یہ صورت بھی متذکرہ وعید سے مستثنیٰ ہو گی۔ اسی طرح "حوز" کا مادّہ عربی زبان میں کسی چیز کے کسی دوسری چیز کے ساتھ جا ملنے اور جڑ جانے کے لئے آتا ہے۔ گویا "مُتَحَيِّزٌ" وہ شخص یا گروہ ہے جو کسی اور شخص یا گروہ کے ساتھ جا کر مل جائے۔ باقاعدہ جنگ کی صورت میں اس کا اطلاق اس پر ہو گا کہ اگر دشمن کی طاقت ہر نسبت و تناسب سے متجاوز ہو جائے تو بغیر اس کے کہ بھگدڑ کی صورت ہو، منظم پسپائی یعنی: ORDERLY RETREAT کی شکل میں اہلِ ایمان کی نفری کو بچا کر دشمن کے

نرغے سے نکال لایا جائے تاکہ وہ اپنے مرکز یا BASE کی جانب سمٹ کر اپنی بڑی جمعیّت سے جا ملے اور مقصد یہاں بھی محض جان بچانا نہ ہو بلکہ از سرِ نو حملہ آور ہونا ہو ـــــ آیات زیرِ درس میں اس قسم کی پسپائی کی بھی اجازت وارد ہوئی ہے اور اُسے بھی وعید سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے ؛

ان دونوں صورتوں میں ایک دقّت یہ پیش آسکتی ہے کہ اصل فیصلہ کُن معاملہ انسان کی نیّت اور اُس کے حقیقی ارادے کا ہے جس پر حتمی حکم لگانا ممکن نہیں ہوتا - اور دیکھنے والے کو شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ صورت "تَحَرُّف للقتال" یا "تحیّز اِلیٰ فِئَۃٍ" کی نہیں ہے بلکہ "فرار عن الموت" کی ہے - چنانچہ بالکل یہی صورت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے دوران غزوۂ مُوتہ کے موقع پر پیش آئی تھی، کہ مسلمانوں کا لشکر کل تین ہزار پر مشتمل تھا اور ادھر شرجبیل بن عمر ایک لاکھ کے ساتھ مقابلے پر آیا - ظاہر ہے کہ مقابلے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور یہ صرف ذوقِ شہادت تھا جس کی سرشاری میں مسلمان اُن سے بھڑ گئے چنانچہ یکے بعد دیگرے تین جلیل القدر صحابہ کمان کرتے ہوئے شہید ہو گئے - بعد میں عَلَم حضرت خالد بن ولید کے ہاتھ آیا اور انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ مسلمانوں کو رُومیوں کے غلبے سے نکال لیا - اب جب یہ لشکر مدینہ واپس پہنچا تو بہت سے مسلمانوں نے اُن کو فراری قرار دیا، اور بجائے اظہارِ غمخواری و ہمدردی کے ان کے سروں پر خاک ڈالنی شروع کر دی - لیکن نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے باوجود کہ خود آپؐ کو حضرت زید ابن حارثہ، حضرت عبداللہ ابن رواحہ، اور حضرت جعفر طیّار رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسی عظیم شخصیّتوں کی شہادت پر حد درجہ صدمہ پہنچا تھا ـــــ لوگوں کے اس قول کی تردید فرمائی اور تسلّی آمیز انداز میں ارشاد فرمایا "تم لوگ فراری نہیں ہو بلکہ دوبارہ حملہ کرنے کی نیّت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو ـــــ الغرض : اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرنے والوں کا صرف جان بچانے کی خاطر میدانِ جنگ سے فرار تو بدترین گناہ ہے، جس کی سزا بھی سخت ترین ہے یعنی حوالۂ جہنّم ہونا ـــــ لیکن اس سے مستثنیٰ ہیں تین صورتیں : ایک یہ کہ معاملہ باقاعدہ جنگ کا نہ ہو بلکہ مہم ہی چھاپہ مار نوعیّت کی ہو - دوسرے یہ کہ کسی وقت پیچھے ہٹ آنا محض ایک جنگی چال کے تحت ہو یعنی یہ پسپائی TACTICAL MOVE

کی نوعیت کی ہو یہ کہ بھگدڑ کی اور تیسرے یہ کہ کسی وقت لشکرِ اسلام کے تحفظ کیلئے منظم پسپائی یعنی ORDERLY RETREAT ناگزیر ہو جائے ـــــ اور یہ باقاعدہ کمانڈر کے حکم کے تحت ہو ۔ واللہ اعلم

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۳)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَاۗءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

● یہ سورۂ انفال کی آیات ۱۷ تا ۱۹ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"(تو اے مسلمانو!) اُن کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا۔ اور (اے نبیؐ!) جب آپ نے اُن پر خاک پھینکی تھی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی اور یہ اس لئے تاکہ وہ مومنوں کو اپنی جانب سے شاندار کامیابی عطا فرمائے، یقیناً اللہ سُننے والا، جاننے والا ہے۔ یہ تو ہے ہی اور (جان لو کہ) اللہ کافروں کی تمام چالوں کو ناکارہ بنا کر رکھ دے گا۔ (اور اے کافرو!) اگر تم واقعتہً فیصلہ چاہتے ہو تو فیصلہ تو تمہارے سامنے آ ہی گیا ہے۔ اور اگر تم باز آجاؤ تو اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اور اگر تم نے دوبارہ یہی کچھ کیا تو ہم بھی پھر یہی کریں گے۔ اور تمہارا اجتماع خواہ کتنا ہی بڑا ہو، تمہارے کچھ کام نہ آسکے گا اور (خوب جان رکھو کہ) اللہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہے!"

اِن آیات میں شہنشاہِ ارض و سماوات نے غزوۂ بدر کے فاتح و مفتوح اور غالب و مغلوب دونوں فریقوں سے خطاب فرمایا ہے ـــــ اہلِ ایمان سے فرمایا گیا کہ جو شاندار کامیابی تمہیں حاصل ہوئی ہے اس پر کسی فخر و غرور میں مبتلا مت ہو جانا۔

تمھاری سرفروشیاں اور جانفشانیاں اپنی جگہ ـــــ لیکن اصلاً یہ جنگ تم نے نہیں اللہ نے جیتی ہے۔ اس لئے کہ اُس میں اصل فیصلہ کُن دخل اُس نصرتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی کو حاصل ہے جس کا ذکر اس سے قبل آیات ۹ تا ۱۲ میں ہو چکا ہے۔ یعنی قلبی اطمینان جس سے سکون بخش نیند یا غنودگی میسّر آئی، بارانِ رحمت کا نزُول جس سے جسمانی طہارت کا حُصول بھی ممکن ہوا اور اس کے نتیجے کے طور پہ وساوسِ شیطانی سے بھی نجات ملی اور ساتھ ہی ریت بھی جم گئی اور اُس کے نتیجے میں قدم دھنسنے کے بجائے جمنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور سب سے بڑھ کر فرشتوں کی غیر مرئی کمک۔ حاصل یہ کہ اے مسلمانو! بظاہر تو کفارِ مکّہ کے ستّر سورماؤں کو تم نے قتل کیا لیکن درحقیقت تم نے نہیں ہم نے قتل کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بات جنگ کی مجموعی صورتِ حال سے بھی بالکل ظاہر ہے کہ کہاں تین سو تیرہ بے سروسامان لوگ اور کہاں ایک ہزار غرق آہن شہسوار، لیکن بعض متعیّن واقعات سے تو اس کا صد فی صد درست ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ مثلاً ابوجہل کے قتل کا واقعہ مادّی سلسلۂ اسباب و علل کے اعتبار سے کسی حساب کتاب میں نہیں آتا۔ وہ لشکرِ کفّار کے اہم ترین سرداروں میں سے تھا اور کیسے ممکن ہے کہ اُس کے آس پاس حفاظتی دستہ نہ ہو۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ عین دورانِ جنگ دو انصاری نوجوانوں حضرتِ معاذؓ اور حضرتِ معوّذؓ نے مجھ سے دریافت کیا کہ "چچا! ہم نے سُنا ہے کہ مکّہ کا ایک سردار ابوجہل نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو بہت ایذائیں پہنچاتا تھا، ہم اسے قتل کرنا چاہتے ہیں، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟ اس پر مَیں نے انہیں اشارے سے بتایا کہ وہ جو عین قلبِ لشکرِ کفّار میں لوگوں کے جمگھٹے میں کھڑا ہے وہی ابوجہل ہے۔ اِس پر وہ دونوں تیر کی طرح جھپٹے اور مَیں کہتا ہی رہ گیا کہ بھتیجو! ٹھہرو، مَیں بھی تمھارا ساتھ دیتا ہوں لیکن وہ فوراً آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور انہوں نے لشکرِ کفّار کے عین قلب میں گھُس کر ابوجہل کو مار گرایا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ عام انسانی دائرے سے باہر کی بات ہے اور حقیقتاً یہ اللہ کی قدرتِ خصوصی کا ظہور تھا، اگرچہ اس کا سہرا اللہ نے ان دو نوجوانوں کے سر باندھ دیا:۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اہل ایمان سے عمومی خطاب کے بعد ایک خصوصی خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہوا کہ اے نبیؐ! جو مٹھی بھر خاک اور کنکر آپؐ نے لشکرِ کفار کی جانب پھینکے تھے، وہ آپؐ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکے تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ جب ابتدائی مبارزت طلبیوں کے بعد عام مقابلے کا وقت آیا اور لشکرِ کفار نے مسلمانوں کی جانب عمومی پیش قدمی شروع کی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مٹھی میں خاک اور کنکریاں لے کر انہیں کفار کے لشکر کی طرف پھینکا اور فرمایا "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ!" (چہرے برباد ہو جائیں!) اور اسے اللہ تعالیٰ نے واقعتہً کفار کے حق میں ایک تیز و تند آندھی سے بڑھ کر تکلیف دہ بنا دیا۔ گویا یہ واقعہ بھی اللہ کی قدرتِ خصوصی ہی کا مظہر تھا۔

الغرض! عام اہلِ ایمان کا تلواروں اور نیزوں سے کام لینا ہو یا نبی اکرمؐ کا مٹھی بھر خاک پھینکنا ان ظاہری صورتوں کے پردے میں مستور اصل فیصلہ کن طاقت و قدرت اللہ ہی کی تھی۔ یہ بات یوں تو ہر آن اور ہر حال ہی میں درست اور مبنی برحقیقت ہوتی ہے، کہیں نسبتاً خفی اور کہیں مقابلتاً جلی کہ یہ "ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!"۔ لیکن غزوۂ بدر میں تو یہ صورت اظہر من الشمس تھی، اس لئے اس مقام پہ اُسے اِس قدر واضح اور دوٹوک الفاظ میں بیان فرمایا۔ اور اس سے اصل غرض تو جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مسلمانوں کو فخر و غرور سے بچنے کی تلقین ہے لیکن ربطِ کلام اور فصاحت و بلاغتِ قرآنی کے اعتبار سے یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہ رہے کہ اس کا ایک تعلق مالِ غنیمت کے متنازعہ مسئلے سے بھی ہے۔ گویا یہ دلیل ہے اُس بات کی جو بالکل آغازِ سورت میں بیان کی گئی تھی کہ اَنْفال و غنائم کُل کے کُل اللہ اور اس کے رسول کا حق ہیں، اس لئے کہ یہ جنگ تم نے نہیں جیتی، اللہ نے جیتی ہے!!

رہا یہ سوال کہ جب سب کچھ اللہ کے کئے ہی سے ہوا تو پھر مسلمانوں سے یہ شمشیر زنی اور تیر اندازی کیوں کرائی گئی تو اس کا حد درجہ معجزنما جواب عطا فرما دیا گیا کہ یہ اس لئے کہ اللہ چاہتا تھا کہ اہلِ ایمان کو ایک امتحان اور آزمائش میں مبتلا بھی کرے اور انہیں اس میں شاندار کامیابی عطا فرما کر اپنے انعام و احسان کا اتمام بھی فرمائے اور اس طرح ان کے ایمان و عمل کو مزید نکھارے اور جلا بخشے

——— اور آئندہ کے لئے اُن کے اس اعتماد اور یقین میں بھی مزید اضافہ فرمائے کہ اللہ کافروں کی تمام کوششوں کو ناکام فرمادے گا اور ان کے تمام داؤں بیکار کرکے رکھ دے گا۔ ؛

اِس کے بعد خطاب کا رُخ کفّار کی جانب پھرتا ہے کہ اے کُفّارِ قریش! اگر تم واقعی اللہ سے فیصلہ کے طالب تھے تو اللہ کا فیصلہ تمہارے سامنے آچکا ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ تم باز آجاؤ اور ہمارے رسول کی مخالفت ترک کرکے ایمان کی پناہ گاہ میں داخل ہوجاؤ۔ لیکن اگر تم باز نہ آئے اور اپنی پرانی رَوِش پر قائم رہے تو ہم بھی دوبارہ یہی کچھ کریں گے۔ اور جس طرح بدر میں تمہاری کثرتِ تعداد اور اسلحہ و ساز و سامان کی بہتات تمہارے کچھ کام نہیں آئی، اسی طرح آئندہ بھی تمہارا جتھہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، اہلِ ایمان پر فتح حاصل نہیں کرسکے گا۔ اس لئے کہ اللہ کی نصرت و تائید اُن کے ساتھ ہے اور وہ بہ نفسِ نفیس ان کا پشت پناہ ہے۔

اس خطاب کا ایک خاص پس منظر ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ جیسا کہ ہر زمانے اور ہر معاشرے میں ہوتا ہے۔ قریشِ مکّہ کے اکثر و بیشتر سردار خوب جانتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں اور ان کی مخالفت کا اصل سبب صرف اپنی سرداریوں اور چودھراہٹوں اور اپنے مفادات یعنی VESTED INTEREST کا تحفظ تھا۔ لیکن عوام کالانعام کو وہ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ورغلاتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم کے خلاف مشتعل کرتے تھے۔ چنانچہ کبھی وہ ان کی جاہلی عصبیتوں کو بھڑکاتے تھے اور آباء و اجداد کے دین اور اسلاف کی روایات کی دہائی دیتے تھے۔ کبھی خود ان کے مالی مفادات کا واسطہ دیتے تھے۔ چنانچہ بدر کی فوج کشی کے لئے فوری سبب اس تجارتی قافلے کے لوٹے جانے کے مفروضہ خطرے کو قرار دیا گیا تھا جس میں مکّے کے ہر گھر کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ مزید برآں یہ لیڈر لوگ اپنے عوام کو مختلف طریقوں سے اپنی نیک نیتی کا یقین بھی دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ بدر کے لئے روانگی سے پہلے ابوجہل اور اس کے کچھ حواری حاضر ہوئے اور انہوں نے خلافِ کعبہ کو پکڑ کر دعا کی: ———

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ اَعْلَی الْجُنْدَیْنِ وَاَکْرَمَ الْفِئَتَیْنِ وَخَیْرَ الْقَبِیْلَتَیْنِ ۝

اے اللہ دونوں لشکروں میں سے جو بہتر ہو اور حق پر ہو اُس کی مدد فرما)۔

درحقیقت یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا اپنے عوام کو یہ باور کرانے کے لئے کہ ہم پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور محمدؐ اور ان کے ساتھی باطل پر ہیں۔ ابوجہل نے یہ حربہ عین میدانِ بدر میں بھی استعمال کیا اور علی الاعلان پکار کر دعا کی کہ: "اَللّٰھُمَّ اقْطَعْنَا لِلرَّحِمِ فَاَحِنْہُ الْغَدَاۃَ!" (یعنی اے اللہ فریقین میں سے جو زیادہ قطع رحمی کا مرتکب ہوا ہو اُسے تو کل کچل ڈالیو!)

اُدھر چونکہ ان سرداروں نے جنگ کی بھرپور تیاری کی تھی اور پوری آن بان اور ساز و سامان کے ساتھ کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکلے تھے اور بظاہر احوال ہر اعتبار سے انہیں اپنی فتح کا یقین کامل حاصل تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس نفسیاتی جنگ یعنی PSYCHOLOGICAL WARFARE کو بھی نقطۂ عروج یعنی CLIMAX پر پہنچا دیا تھا، بایں طور کہ ڈھنڈورہ پیٹ دیا تھا کہ بدر کا دن "یَوْمُ الْفُرْقَانِ!" ہوگا اور ثابت ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر اس لئے کہ جو جیتے گا معلوم ہو جائے گا کہ اللہ اُس کے ساتھ ہے اور اُس کا موقف مبنی برحق ہے ——— یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ چال خود اُن ہی پر اُلٹ دی اور یومِ بدر کو واقعتہً یوم الفرقان بنا دیا۔ آیتِ زیرِ درس میں گویا قریش کے عوام کو مخاطب کر کے انہیں اپنے لیڈروں کے پیدا کردہ مغالطوں کے جال سے نکلنے کی ترغیب دی جا رہی ہے ——— کہ اگر تم واقعتہً یہی سمجھتے تھے کہ یہ جنگ طے کرے گی کہ اللہ کس کے ساتھ ہے اور کون حق پر ہے تو وہ فیصلہ تو بالکل غیر مبہم انداز میں تمہارے سامنے آ گیا ہے۔ لہٰذا اب تمہیں چاہیئے کہ اپنی روش پر نظرثانی کرو، اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ!" کی مخالفت سے باز آ جاؤ۔ ساتھ ہی شدید وعید بھی سنا دی گئی کہ اگر تم باز نہ آئے تو خوب جان رکھو کہ اللہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہے ——— یعنی تمہارا مقابلہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جاں نثار اہلِ ایمان کے ساتھ نہیں بلکہ خود اللہ کے ساتھ ہے ——— اور ظاہر ہے کہ جہاں مقابلہ اللہ سے ہو وہاں نہ تعداد کی کثرت کام آ سکتی ہے نہ ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ کی بہتات!! تم اس طرح شکست پر شکست کھاتے چلے جاؤ گے تا آنکہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ!" اللہ کے دین کا بول بالا ہو کر رہے گا اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ!" کامیاب و کامران ہوں گے ——— جیسا کہ فی الواقع چند ہی سال کے اندر اندر یہ بھی ہو گیا۔!!

غزوۂ بدر

جناب حفیظ جالندھری کے "شاہنامۂ اسلام" سے چند منتخب اشعار

فضائے بدر کو اک آپ بیتی یاد ہے اب تک ❊ یہ وادی نعرۂ توحید سے آباد ہے اب تک
مہ و انجم یہ اِس مٹی کے ذرّے مسکراتے ہیں ❊ زُبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں
جو دیکھا اُس کی آنکھوں نے وہ کب افلاک نے دیکھا ❊ حق و باطل کا پہلا معرکہ اس خاک نے دیکھا
مرے پیشِ نظر کوئی کہانی ہے نہ قصّہ ہے ❊ یہ قرآنی بیان، تاریخ کا زرّیں حصّہ ہے
خدا کے بالمقابل جمع کر کے اِک خُدائی کو ❊ اُٹھے تھے پہلوانانِ عرب زورِ آزمائی کو
قریشی فوج کو لے کر چلا شیطان مکّے سے ❊ مدینے کی تباہی کو اُٹھا طوفان مکّے سے
یہ مشرک جا رہے تھے حق پرستی کے مٹانے کو ❊ یہ آندھی چل رہی تھی شمعِ ہستی کے بجھانے کو
یہ شمشیریں، یہ خنجر، یہ تبر، یہ تیر، یہ بھالے ❊ یہ سب مردانِ جنگی اُونچی اُونچی کلغیوں والے
یہ مکّے سے چلے تھے اور مدینے پر چڑھائی تھی ❊ اِدھر نامِ خدا تھا، اُس طرف ساری خدائی تھی
زمینِ بدر تک جب آ گیا سیلِ سیہ کاری ❊ مدینے سے اُٹھا نورِ خُدا بہرِ ضیا باری
مبارک جمعہ کا دن، سترھویں تھی ماہِ رمضاں کی ❊ شہادت گاہ میں فوج آ ہی پہنچی اہلِ ایماں کی
عجب انداز سے آئے خدا کے چاہنے والے ❊ زبانیں خشک، پوشاکیں دریدہ، پاؤں میں چھالے
مئے وحدت سے قلبِ مطمئن سرشار تھا اُن کا ❊ کہ سردارِ دو عالم قافلہ سالار تھا اُن کا
نہیں تھا تین سو تیرہ سے آگے تک شمار اُن کا ❊ سُنا یہ ہے کہ اُن کے ساتھ پروردگار اُن کا
یہ اِس میدان کا خشک اور ریتیلا کنارا تھا ❊ نگاہِ ابرِ رحمت کا اِسی جانب اشارہ تھا
قدم ٹکنے نہ دیتی تھی زمیں پر دھوپ کی گرمی ❊ قدم آگے بڑھانے میں تھی مانع ریت کی نرمی
اُڑی جاتی تھی ریگِ دشت گرمی سے ہوا ہو کر ❊ زمیں پر بچھ گئی تھی دھوپ، آتش زیرِ پا ہو کر
ہوا سیماب، مٹی ماہیِ بے آب تھے گویا ❊ فضا بارانِ رحمت کے لئے بے تاب تھی گویا

صحرا کی دُعا

یہ تشنہ لب جماعت جب یہاں پر رُک گئی آ کر ❊ دُعا کی دامنِ صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر

کہ اے صحرا کو آتشناک چہرہ بخشنے والے ❖ رُخِ خورشید کو کرنوں کا سہرا بخشنے والے
ازل کے دن سے اب تک بھاڑ میں بھنتا رہا ہوں مَیں ❖ صلائے باد و بارانْ دُور سے سُنتا رہا ہوں مَیں
ہوا ہوں جیسے پپیا جان پانی کو ترستی ہے ❖ مرے سینے کے اُوپر آگ کی بدلی برستی ہے
مَیں سمجھا تھا مقدّر ہو چکی ہے دُھوپ کی سختی ❖ مری قسمت میں لکھی جا چکی ہے سوختہ بختی
بنایا رفتہ رفتہ سخت مَیں نے بھی مزاج اپنا ❖ لیا ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج اپنا
خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا ❖ کہ تیرا ساقیؐ کوثرؐ یہاں تشریف لائے گا
اگر یہ بات پہلے سے مجھے معلوم ہو جاتی ❖ مرے دل کی کُدورت خود بخود معدوم ہو جاتی
خبر کیا تھی یہاں تیرے نمازی آ کے ٹھہریں گے ❖ شہید آرام فرمائیں گے، غازی آ کے ٹھہریں گے
خبر کیا تھی ملے گی یہ سعادت میرے دامن کو ❖ بنایا جائے گا فرشِ عبادت میرے دامن کو
خبر ہوتی تو مَیں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا ❖ چھپا کر ایک گوشے میں مُصفّا حوض بھر رکھتا
وہ پانی اِن مقدّس میہمانوں کو پلا دیتا ❖ مَیں اپنی تشنگی دیدارِ حضورؐ سے بجھا لیتا
مرے سر پر سے گزرا نوحؑ کے طوفان کا پانی ❖ تأسّف ہے کہ مجھ سے ہو گئی اُس وقت نادانی
اگر کرتا مَیں اِس پانی کی تھوڑی سی نگہداری ❖ تو ہو جاتا مری آنکھوں سے چشموں کی طرح جاری
یہ شُتر، اُونٹ، ٹٹو، گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے ❖ مجاہد بھی وضو کرتے، نہاتے، غسل فرماتے
حضورِ ساقیؐ کوثر مری کچھ لاج رہ جاتی ❖ مری عزّت، مری شرمِ عقیدت آج رہ جاتی
برائے چند ساعت ابرِ بارانْ بھیج دے یارب ❖ بہاراں بھیج دے یارب، بہاراں بھیج دے یارب
جلیل الشّان مہمانوں کا صدقہ مہربانی کر ❖ عطا بہرِ وضو ان کے لئے تھوڑا سا پانی کر

بارش کا نزول

دُعا صحرا نے مانگی دامنِ اُمّید پھیلا کر ❖ یکایک ابرِ بارانْ آسمانْ پر چھا گیا آ کر
انہی کی منتظر تھی غالباً شانِ الٰہی بھی ❖ کہ پیاسے تھے محمدؐ بھی محمدؐ کے سپاہی بھی
مدینے کی بلندی سے جو رحمت کی گھٹا آئی ❖ تو استقبال کو فردوس کی ٹھنڈی ہوا آئی
یہ ریگستانْ کہ اِک اِک بوند پانی کو ترستا تھا ❖ اِسی پر آج بادل چھا گئے تھے، مینہ برستا تھا
برس کر کھُل گیا بادل، زمینْ پر بھر گیا پانی ❖ ہوئی اب چلنے پھرنے، بیٹھنے اُٹھنے میں آسانی
نزولِ آب سے تسکین و راحت ہو گئی طاری ❖ مِٹی تشنہ لبی، گردِ کُدورت دُھل گئی ساری
سپاس و شکر سے لبریز تھا دل اس جماعت کا ❖ بنا کر حوض پانی بھر لیا بارانِ رحمت کا

حقیقت و اقسامِ شرک (۱۰)

شرک فی المحبّت

ڈاکٹر اسرار احمد

(سلسلہ کے لئے دیکھئے 'میثاق'، بابت اگست ۷۸ء)

اُصُول کا ہتھیار اب آیئے، حسبِ سابق قرآن مجید اور احادیث شریف سے اُصُول متعیّن ہو جانے کے بعد ان اُصولوں کا ہتھیار ہاتھ میں لے کر اپنے معاشرے کے ان مشرکانہ اعتقادات و اعمال کا تجزیہ کریں جو بڑی گہری جڑیں جمائے ہوئے ہیں۔ اس لئے جب تک ان تمام نظریات و افعال کی جڑوں پر تیشہ نہیں چلایا جائے گا، جن میں شرک رچا بسا ہوا اور سرایت کئے ہوئے ہے، اس وقت تک خالص و حقیقی توحید واضح نہیں ہو گی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ نورِ توحید یا آفتابِ توحید کو ظلماتِ شرک نے ڈھانپ رکھا ہے۔ ہمیں ان اندھیاروں اور ظلمات کے پردوں کو چاک کرنا ہو گا تاکہ نورِ توحید سے ہمارے معاشرے کے قلوب منوّر ہو سکیں۔ اس ضمن میں ہمیں اس امر کی قطعی پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ اُصول کے ہتھیار کی کاٹ کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔ عبادت میں محبّت الٰہی کا مقام ہم پر از روئے کتاب و سُنّت واضح ہو چکا۔ آیئے! اب شرک فی المحبّت کی تمام اقسام کو اس ہتھیار سے کاٹتے چلے جائیے۔ اس شرک فی المحبّت کے بھی دو دائرے ہیں۔ ایک انفرادی دائرہ اور ایک اجتماعی دائرہ۔ ان دونوں کا ہمیں علیحدہ علیحدہ تجزیہ کرنا ہو گا۔

حبِّ مال پہلے انفرادی دائرے کا جائزہ لیجئے تو نظر آئے گا کہ ہمارے عوام سے لے کر خواص تک سب لوگ اِلّا ماشاء اللہ سب سے زیادہ جس محبّت میں مبتلا ہیں وہ ہے مال کی محبّت! مال کی محبّت تقاضا کرتی ہے کہ اِسے حاصل کرو، جہاں سے بھی اور جس ذریعے سے بھی حاصل ہو۔ آج کا مسلمان مال کی محبّت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز معدوم کے درجے میں آگئی ہے۔ اللہ کا قانون اور شریعت کا ضابطہ کہتا ہے کہ حرام ذرائع سے مال مت حاصل کرو لیکن مال کی محبّت کہتی ہے کہ کیسا حلال، کیسا حرام؟ جو آسودہ حال ہیں، ان پر مزید کمانے کی ہوس سوار ہے۔ جھوٹ سے حاصل ہو، سودی لین

دین سے حاصل ہو، اسمگلنگ سے حاصل ہو، بلیک مارکیٹنگ سے حاصل ہو، اِرتکازِ مال سے حاصل ہو، منشّیات کی خرید و فروخت سے حاصل ہو، خورد و نوش کی اشیاء میں ملاوٹ سے حاصل ہو۔ نقلی اور جعلی ادویہ بنانے سے حاصل ہو۔ ان کو حصولِ مال میں ان چیزوں کے حرام ہونے کی سرے سے پروا ہی نہیں۔ جو اوسط آمدنی کے حامل ہیں یا ملازمت پیشہ ہیں ان پر بھی اپنا زندگی بلند کرنے کی دھن سوار ہے۔ رشوت آج هَنِيئًا مَّرِيئًا بن گئی ہے بلکہ اس کو ہٰذا مِن فضلِ ربّی سے منسوب کر کے جسارت اور ڈھٹائی کی آخری حدوں کو بھی پھلانگ لیا گیا ہے۔ دیانت و امانت، ایفائے عہد اور احساسِ ذمّہ داری عنقا ہیں۔ جو لوگ غریب اور مزدور یا کاشتکار طبقے سے متعلق ہیں وہ حسد و نفرت کے شکار ہیں۔ کام چوری ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ اُٹھائی گیری، کم تولنا، کم ماپنا، کم ناپنا ان کے معمولات میں شامل ہو چکا ہے۔ غرض کہ حُبِّ مال نے پوری طرح ہمارے معاشرے کے ہر فرد کے ذہن پر پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور پورا معاشرہ مال کی محبّت کی گرفت میں ہے۔ ہر طبقے میں مستثنیات ہیں لیکن وہ اتنی قلیل ہیں کہ معدوم کے درجے میں آتی ہیں۔ آج قناعت عنقا ہے۔ اس دور کا مسلمان اِلّا ماشاء اللہ بری طرح مال کی محبّت میں مبتلا ہے۔ کیسا دین اور اس کے احکام! کیسا حلال و حرام اور اس کے ضوابط! کیسی امانت و دیانت! کیسی آخرت اور اُس کا احتساب! کیسا اخلاق اور اُس کے تقاضے! کیسا معاشرہ اور اُس کی ذمّہ داریاں!۔ آج مسلمان کہلانے والوں کا وہی حال ہے جو سورۃ الھمزہ میں یوں کھینچا گیا : الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهُ اَخْلَدَهُ ۝ : "(تباہی ہے) اس شخص کے لئے جو مال جمع کرتا اور اُس کو گن گن کر رکھتا ہے (اور) خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہوگا!"۔ یا جس کا نقشہ سورۃ التکاثر میں یوں بیان کیا گیا ہے : اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ "(لوگو!) تم کو مال کی بہتات کی طلب نے (انجامِ آخرت) سے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں!"۔ یعنی موت آنے تک تم مال کی حرص و آز میں مبتلا رہے۔ پس معلوم ہوا از روئے قرآن مجید حبِّ مال دنیا پرستی ہے، خدا پرستی نہیں۔ اِسی لئے فرمایا گیا کہ : لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ اور سورۂ توبہ کی آیت ۲۴ میں، جس کا میں ابھی حوالہ دے چکا، اہلِ ایمان کو متنبّہ کر دیا گیا کہ علائقِ دنیوی اور مال و اسبابِ دُنیوی کی محبّت اللہ کی، رسول کی اور راہِ جہاد کی محبّت سے محبوب تر ہے تو اللہ تعالیٰ کو ایسے فاسقوں کی ضرورت نہیں ہے، ایسے لوگ گو مگو

کی حالت میں مبتلا رہیں۔ ایسے دنیا داروں کے متعلق اللہ تعالیٰ جلد فیصلہ فرما دے گا۔

فتنہ | قرآنِ حکیم نے مال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا : اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط (۱۵) : "بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے"۔ فتنہ عربی زبان میں کسوٹی کو کہتے ہیں، جس پر یہ پرکھا جاتا ہے کہ سونا خالص ہے یا اُس میں ملاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کی فطری محبت میں تجاوز تو نہیں کرتا اور اُس کی محبت کو اپنے خالقِ حقیقی کی محبت کے برابر تو نہیں لا بٹھاتا، یا اُس پر فوقیت تو نہیں دیتا۔ اگر یہ محبتیں اللہ کی محبت کے تابع رہیں تو فَهُوَ الْمُرَادُ لیکن اگر مال و اولاد کی محبت غالب آ گئی تو یہی ہلاکت و بربادی اور خسران ابدی ہے۔ چنانچہ سورۃ المنافقون میں اہلِ ایمان کو نصیحت کر دی گئی اور اُن کو متنبہ کر دیا گیا کہ ہر وقت چوکس اور ہوشیار رہنا کہیں یہ محبتیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں یعنی تم کو یہ خیال اور دھیان ہی نہ رہے کہ تم کو اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہو کر اس دنیا میں اپنے رویے، اپنے اعمال و افعال کا حساب دینا ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥
(آیت ۹)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں (انجام کار کے لحاظ سے) وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔

مال کا بندہ | حدیث شریف میں آتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کو جو مال کی محبت میں اتنا آگے بڑھ جائے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی پرواہ نہ رہے، عبد الدینار اور عبد الدرہم (دینار اور درہم کا بندہ) قرار دیا ہے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کے پرستاروں کے لئے فرمایا : تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ ۔ حضور کا یہ فرمان کلمۂ دعائیہ (بددعا) بھی ہو سکتا ہے، اور کلمۂ خبریہ بھی۔ اس کو بددعا قرار دیا جائے تو اس کا ترجمہ ہوگا : "تباہ و برباد ہو جائے دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ (مال پرست)"۔ اور اگر اس کو خبر قرار دیا جائے تو اس کا ترجمہ

(بقیہ ص۵۷ پر دیکھئے)

قسط اوّل

اِعجازِ قرآن کی حقیقت و تصدیق

بذریعہ کمپیوٹر

از: غازی عُزیَر ❖ محلّہ شیخان، اپر فورٹ، علی گڑھ (یو۔پی) اِنڈیا

اعجازِ قرآن کی تعریف و حقیقت جب کبھی دُنیا میں کُفر و ضلالت کے بادل چھائے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُس کی تکذیب کے لئے اپنے انبیاء کو بھیجا اور انہیں اس پر مامور فرمایا کہ وہ اللہ کے رسول کی حیثیّت سے اپنے آپ کو بندوں کے سامنے پیش کریں، اُن کو اس گمراہی و ضلالت سے نکال کر اللہ ربّ العٰلمین کی اطاعت و بندگی کی طرف دعوت دیں۔ لیکن جب بھی پیغمبروں نے اپنے آپ کو فرستادۂ ربّ العٰلمین کی حیثیّت سے دُنیا والوں کے سامنے پیش کیا، اور ان کو احکاماتِ خداوندی کی تعلیم دینا شروع کی تو لوگوں نے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربّ العٰلمین کے نمائندے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہونا چاہیئے جو قوانینِ فطرت کی عام رَوِش سے ہٹا ہوا ہو اور جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ ربّ العٰلمین نے تمہاری صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنی براہِ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر فرمایا ہے۔ انہی مطالبات کے جوابات میں انبیاء علیہم السّلام نے مختلف زمان و مکان میں مختلف خارقِ عادت نشانیاں دکھائیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں "آیات" اور متکلّمین کی اصطلاح میں "معجزات" کہا جاتا ہے ❖

قرآنِ کریم میں معجزات کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن میں سے چند یہاں مثال کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں: مثلاً حضرت صالح علیہ السّلام کی اونٹنی کا معجزہ، حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ہاں بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش، حضرت یوسف علیہ السّلام

کا معجزہ ، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے معجزات (لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا سورج کی مثل روشن ہوجانا) حضرت ایوب علیہ السّلام کے لئے زمین سے چشمہ کا نکلنا، حضرت یونس علیہ السّلام کا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا ، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا بے باپ کے پیدا ہوجانا اور گہوارہ میں کلام کرنا اور مسیح ہونا ، حضرت سلیمان علیہ السّلام کا پرندوں کی بولیوں کو سمجھنا ، ملکۂ سباء کا تخت آنا ، جنّات و حشرات الارض اور پرندوں کا مسخّر کرنا اور حضرت زکریا علیہ السّلام کے ہاں بوڑھی اور بانجھ بیوی کے ہاں ولادت وغیرہ وغیرہ - قرآن کریم میں لفظِ معجزہ کہیں بھی اِس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے ، بلکہ اُس کی جگہ " آیۃ " اور " برُہان " عموماً مستعمل رہے ہیں - علی بن ربّان طبری کی کتاب ، جو سنہ ۲۴۰ھ میں مکمّل ہوئی تھی ، میں بھی لفظِ آیۃ اور برُہان ہی کا استعمال جگہ جگہ پر ہوا ہے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس لفظ نے زیادہ رواج نہیں پایا تھا - امام احمد بن حنبل رح نے اپنی تصانیف میں لفظِ " معجزہ " کو استعمال تو کیا ہے لیکن اس اصطلاح کو انبیاء علیہم السّلام کے لئے خاص نہیں رکھا ، بلکہ اولیاء و اصفیاء کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور اُن کے خارقِ عادت افعال کو بھی معجزہ ہی لکھا ہے - بعد میں اولیاء و اصفیاء کے افعال کو کرامت کا نام دے کر دونوں اصطلاحوں میں فرق پیدا کیا گیا - تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں " اعجاز القرآن " مکمّل ہوئی تھی - پس اُس کے مطالعہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بعد کے دور میں " برُہان " اور " آیۃ " کا رواج رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا اور اُس کی جگہ " معجزہ " اور " اعجاز "ؔ نے لے

ؔ لفظِ اعجاز کے لغوی معنی مجبور کرنا اور عاجز کرنا ہیں - لفظِ معجزہ اِسی سے مشتق ہوا ہے - متکلمین اسلام نے معجزہ کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں - اگرچہ اُن میں سوائے الفاظ کی ترتیب یا اُن کی توضیح کے کوئی اختلاف نہیں ہے - معجزہ کی ایک تعریف یہ ہے : " وایدھم بالمعجزات الناقضات للعادات " (شرح عقائد نسفی) دوسری تعریف یہ ہے : " امرٌ خارقٌ للعادۃ مقرونٌ بالتحدی سالمٌ عن المعارضۃ " (الاتقان ج ۲ صـ۱۱۶) معجزہ کے شرائط میں بھی بہت معمولی فرق ہے - محمّد بن نسفی نے کسی فعل کے معجزہ ہونے کی یہ چار شرطیں بتائی ہیں : (۱) وہ فعل خارقِ عادت ہو (۲) جو اس کو ظاہر کرے وہ نبوّت کا مدّعی ہو (۳) وہ معجزہ اس وقت ظاہر کرے جب کفّار کے ساتھ معارضہ کرے (۴) وہ معجزہ ایسا ہو کہ منکرین اُس کا مثل نہ لا سکیں (شرح عقائد نسفی) باقی آئندہ صفحہ پر

ہی۔ پچھلی آسمانی کتب میں تحریفِ کثیر کے باعث چونکہ پچھلے پیغمبروں کے معجزات کا صحیح مشاہدہ ہمارے لئے محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ نیز چونکہ ہمارا مقصد اعجازِ قرآن کی تحقیق و تصدیق ہے اس لئے ہم پر لازم آتا ہے کہ دوسرے انبیاء کے معجزات سے صرفِ نظر کرکے خدا تعالیٰ کے آخری نبی، جن کی گواہی خدا تعالیٰ نے اِن الفاظ میں دی ہے: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۝ (الاحزاب ۴) "(مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں!") کی تعلیمات و معجزات پر غور و فکر کریں۔ یقینی امر ہے کہ تمام نبیوں کی طرح حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خداوند تبارک و تعالیٰ نے دلیلِ نبوت کے طور پر کوئی نہ کوئی معجزہ عطا فرمایا ہوگا۔ کیونکہ اُن کی تعلیمات اور معجزات آج بھی اسی طرح اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں اور تا قیامت اُن میں کوئی رد و بدل ممکن نہیں، اِس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ پس ہم ان کا آج بھی بچشمِ خود مشاہدہ و مطالعہ کر سکتے ہیں اور ان کو محسوس و مشہود اور فکری و تجرباتی علوم کی کسوٹی پر پرکھ بھی سکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کیا ہیں؟ ٹھیک یہی سوالات کفارِ عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت پوچھے تھے جب انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔ قرآن میں اُن کے استفسارات کا ذکر آتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (طٰہٰ ۔ ۱۳۳)

وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟

اور جگہ ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (الرعد ۔ ۷)

یہ لوگ جنھوں نے (رسالتِ محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتری!

بقیہ صفحہ گذشتہ: محمد بن احمد القرطبی نے کسی فعل کے معجزہ ہونے کے پانچ شرائط بیان کئے ہیں (۱) یہ فعل صرف خدا کے اختیار میں ہو (۲) خارقِ عادت ہو (۳) مدعیٔ نبوت پہلے سے اعلان کر چکا ہو کہ ایسا ہونے والا ہے (۴) واقعہ بتمام و کمال اسی اعلان کے مطابق ہو (۵) کوئی اور شخص ویسا عمل نہ کر سکے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

اُن کے سوالات کا جواب خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح فرمایا ہے :

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف - ۲۰۳)

ان سے کہو کہ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے ربّ نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمھارے ربّ کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں!

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تو صرف ایک رسول ہوں اور میرا منصب یہ ہے کہ جس ذاتِ باری نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افروز نشانیاں موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے :

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (العنکبوت : ۴۹، ۵۰)

دراصل یہ روشن نشانیاں (معجزات) ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنھیں علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے ربّ کی طرف سے۔ کہو نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر ——— !!

اِسی قسم کے سوالات کے جواب میں مزید یہ فرمایا گیا کہ :-

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد - ۳۰)

اے محمدؐ! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گذر چکی ہیں۔ تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں!

ایک حدیثِ نبویؐ میں فرمایا گیا ہے :

وما من الانبیاء نبیؑ الّا اعطیٰ من الاٰیٰت ما مثلہ اٰ ومن او) امن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیتہ وحیا اوحاہ اللہ الی فأرجوانی اکثرھم تابعًا یوم القیامۃ	کوئی نبی ایسا نہیں جسے کوئی نشانی نہ عطا کی گئی ہو کہ لوگ اس پر ایمان لائیں۔ مجھے جو چیز دی گئی ہے وہ اللہ کی وحی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیرو سب سے زیادہ ہوں گے۔

(صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنّۃ)

قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم وہ آسمانی کتاب ہے جس میں اب تک کی تمام کتب آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ اُن کفّارِ عرب کے استفسارات کا جواب تُرکی بہ تُرکی دیا گیا۔ لیکن اِن تمام کے بعد بھی نشانی کا مطالبہ کیا جاتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں نشانیوں کا فقدان نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی ہدایت طلبی اور قبولِ حق کی آمادگی کا فقدان ہے، ورنہ نشانیاں تو زمین و آسمان میں بے حد و حساب پھیلی ہوئی ہیں جو پیغامِ محمّدیؐ کی صداقت کا اطمینان دلانے کیلئے کافی سے زیادہ ہیں۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی نشانی اُن کے لئے باعثِ اطمینان نہیں بنتی کیونکہ وہ حق کے متلاشی اور خدا کے راستے پر چلنے کے خواہشمند ہی نہیں ہیں۔ جب یہ صورتِ حال ہے تو کس طرح توقّع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی خارقِ عادت معجزۂ نبویؐ کو دیکھ کر پچھلی قوموں کی طرح محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو جادوگر نہ بتاتے اور ایمان لے آتے۔ یقیناً اُن کے لئے ایسی تمام نشانیاں بیکار ثابت ہوتیں۔ اسی بات کو قرآنِ کریم میں یوں بیان فرمایا گیا ہے :

وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (یُونُس - ۱۰۱)	اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے اُن کے لئے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں ؟

اور اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ کسی خارقِ عادت معجزے کو دیکھ کر رسولؐ اللہ کو صادق مان لیتے تو یہ مسئلہ درپیش ہوتا کہ وہ معجزہ ایک وقتِ معیّن اور افراد کا پابند ہوتا جس کا مشاہدہ بعد کی اُمّت کے لئے ناممکن ہوتا۔ مگر ایسا نہ کرنے میں خدا تعالیٰ کی یہ

زبردست حکمت تھی کہ قرآن کی شکل میں ایک دائمی معجزہ پیش کیا جائے۔ کفارِ عرب کے بار بار اصرار پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خارقِ عادت معجزہ نہ دکھا پائے کیونکہ تمام معجزات خدا تعالیٰ ہی کی عطا کردہ نشانیاں ہوتے ہیں۔ کسی نبی کو ان پر اختیار نہیں ہوتا، جس کا قرآن کریم ان الفاظ میں شاہد ہے :

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ

اور کسی رسول کو بھی یہ طاقت نہیں تھی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی خود دکھا سکے

(سورۂ رعد : ۳۸)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کوئی خارقِ عادت معجزہ نہ دکھانے میں خدا تعالیٰ کی ایک زبردست مصلحت یہ بھی تھی کہ انہیں مشرکین سے صرف نبوت منوا لینا نہ تھا بلکہ اُن کی ہدایت اور ان کی فکر و بصیرت کی اصلاح مطلوب تھی۔

قرآن کے معجزہ و نشانی ہونے کے دلائل پر مفصل بحث اِن شاء اللہ آگے آئے گی فی الحال صرف ایک ثبوت جو یقیناً کافی اہم ہے، پیش ہے : اور وہ یہ ہے کہ جس دور میں قرآنِ کریم نازل ہونا شروع ہوا، اُس دور میں اہلِ عرب کی زبان نہایت اعلیٰ مانی جاتی تھی، اِسی باعث وہ دوسری زبان بولنے والوں کو اپنے مقابلہ میں گونگا تصوّر کرتے تھے، ایسے معاشرہ میں دنیا کی سب سے زیادہ جامع و بسیط اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں ایک ایسی بے نظیر کتاب کا نازل ہونا جس میں پچھلی کُتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیائے سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ اور تمدّن و اخلاق و معیشت کے وسیع اور اہم مسائل پر گہرے علم کا اظہار پایا جاتا ہے وہ بھی ایک ایسے اُمّی شخص پر، جس نے نہ کبھی اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھی تھی اور نہ ہی کبھی قلم ہاتھ میں پکڑا تھا، یقیناً اِس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ علم اُن کو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوا ہے، پس ایک معجزہ ہے، اگر وہ علم دان ہوتے تو اُن کی صداقت پر شک ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں ہے، اس لئے یہ بھی خدا تعالیٰ کی ایک واضح اور قابلِ قبول نشانی ہے۔

آپ خود ہی سوچئے کہ ایک ناخواندہ و نانوشتہ شخص کا قرآن جیسی کامل ترین کتاب پیش کرنا اور اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کی کوئی پہلے تیاری مشاہدہ میں نہیں

آئی، کیا اُن کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن نشانی نہیں ہے؟ دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی روشن اور واضح نشانیوں کا مجموعہ ہے۔

قرآن کریم محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے یا نہیں؟ قدماء کے درمیان بھی اس موضوع پر خاصی بحوث ہوئی ہیں۔ چنانچہ خاص اس موضوع پر انہوں نے کافی کُتُب لکھی ہیں۔ اِن کُتب کے علاوہ بعض مفسّرین و متکلّمین نے ضمناً اپنی تفاسیر یا علم الکلام کی کُتب میں بھی بحوث اس پر چھیڑی ہیں۔ ہم یہاں قدماء کی کاوشوں کا ایک خاکہ پیش کر رہے ہیں (۱) کتاب اعجاز القرآن تألیف الواسطی (۲) القول فی بیان اعجاز القرآن تألیف محمدؐ بن محمدؐ الخطابی (۳) کتاب النکت فی اعجاز القرآن تألیف علی بن عیسیٰ الرمّانی مطبوعہ جامعہ ملّیہ دہلی ۱۹۳۴ء (۴) کتاب دلائل اعجاز تألیف عبد القاہر الجرجانی مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ (۵) کتاب اعجاز القرآن تألیف عبد الواحد بن اسمٰعیل الروبانی (۶) کتاب اعجاز القرآن تألیف محمدؐ بن یحییٰ ابن سراقہ (۷) کتاب اعجاز القرآن تألیف ابو بکر محمدؐ الباقلانی مطبوعہ مصر ۱۹۳۰ء (۸) کتاب الصرفہ فی اعجاز القرآن تألیف علی بن الحسین الشریف المرتضیٰ (۹) بیان البرہان فی اعجاز القرآن تألیف ابن ابی الاصبع القروانی (۱۰) کتاب التنبیہ علی اعجاز القرآن تالیف ابن بابجوک البقالی (۱۱) کتاب ایجاز البرہان فی اعجاز القرآن تالیف ابراہیم بن احمد الجزری (۱۲) کتاب اعجاز القرآن تألیف محمدؐ بن الحسین الخزاعی (۱۳) رسالہ فی اعجاز القرآن تألیف ابن کمال پاشا (۱۴) کتاب اعجاز تألیف قاسم بن قروہ الشاطبی (۱۵) کتاب التبیان فی علم البیان المطلع علی اعجاز القرآن تألیف عبد الواحد الزملکانی (۱۶) کتاب اعجاز القرآن تألیف نصیر بن عبد السیّد المظرزی (۱۷) اعجاز القرآن والفصاحۃ النبویۃ تألیف مصطفےٰ صادق الرافعی مطبوعہ مصر (۱۸) کتاب الطراز تالیف یحییٰ بن حمزۃ العلوی مطبوعہ مصر ۱۹۱۴ء ـــ یہ ہیں کچھ کتابوں کے نام جن کو تین صدی ہجری کے بعد لکھا گیا۔ یہ تمام کتابیں خالص اسی موضوع پر لکھی گئی تھیں۔ مقامِ صد افسوس ہے کہ اُن میں سے صرف چند کتب ہی شائع ہو سکی ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو نایاب ہیں یا پھر مخطوطات کی شکل میں ہی کتب خانہ کی زینت ہیں۔ ذیل میں ہم کچھ ان کُتُب کے نام لکھتے ہیں جن میں اس موضوع

پر ضمناً بحوث کی گئی ہیں :

(۱) تفسیر طبری تألیف ابن جریر طبری مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ (۲) تفسیر قمی تألیف حسن بن محمد قمی نیشاپوری بر حاشیہ تفسیر طبری مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ (۳) کتاب الجامع لاحکام القرآن تألیف محمد بن احمد القرطبی (۴) لصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز تألیف مجد الدین الفیروز آبادی مطبوعہ مصر ۱۳۸۴ھ (۵) تفسیر القرآن تألیف فخر الدین الرازی (۶) کتاب التسہیل لعلوم القرآن تالیف محمد بن جزی الکلبی (۷) الاتقان فی علوم القرآن تألیف جلال الدین السیوطی مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ (۸) البرہان فی علوم القرآن تألیف محمد بن عبد اللہ الزرکشی (۹) مقدمہ تفسیر القرآن تألیف الراغب الاصفہانی مطبوعہ مصر ۱۳۳۹ھ (۱۰) تفسیر الکشاف تألیف محمود بن عمر الزمخشری مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء (۱۱) تفسیر القرآن تألیف ابن عطیہ الغرناطی (۱۲) تفسیر القرآن تألیف اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر مطبوعہ مصر ۱۹۲۴ء (۱۳) تفسیر القرآن تألیف عمر بن محمد النسفی (۱۴) تفسیر المنار تألیف رشید رضا مطبوعہ مصر (۱۵) الفوز الکبیر فی اُصول التفسیر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مطبوعہ کلکتہ (۱۶) جامع الجلی والخفی فی اُصول الدین والرد علی الملحدین تألیف ابو اسحٰق الاسفرائینی (۱۷) کتاب الاعتقاد والہدایۃ الی سبیل الرشاد تألیف ابو بکر احمد بن الحسین البیہقی (۱۸) کتاب اُصول الدین تألیف عبد القاہر بن طاہر البغدادی مطبوعہ استنبول ۱۹۲۸ء (۱۹) ابکار الافکار تألیف علی بن ابی علی الآمدی (۲۰) شرح مقاصد الطالبین فی اُصول الدین تألیف سعد الدین التفتازانی مطبوعہ استنبول ۱۲۷۷ھ (۲۱) اعلام النبوۃ تألیف علی بن محمد الماوردی مطبوعہ مصر ۱۳۱۵ھ (۲۲) توثیق عری الایمان فی تفصیل حبیب الرحمٰن تألیف ہبۃ اللہ البارزی (۲۳) شرح المواقف الایجی مطبوعہ لیپزک ۱۸۴۸ء (۲۴) المواقف تألیف الشریف الجرجانی (۲۵) کتاب الشفاء تالیف قاضی عیاض مطبوعہ مصر ۱۹۱۱ء (۲۶) نہایات الأقدام فی علم الکلام تالیف محمد بن عبد الکریم الشہرستانی مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۳۱ء (۲۷) کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد تألیف ابو حامد الغزالی مطبوعہ مصر ۱۹۱۶ء (۲۸) کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل تالیف علی بن احمد ابن حزم مطبوعہ مصر ۱۹۰۳ء (۲۹) اظہار حق تألیف رحمۃ اللہ الہندی مطبوعہ مصر ۱۳۰۹ھ (۳۰) کتاب الخراج والجراح تألیف ابو الحسین

سعید بن ہبۃ اللہ القطب الراوندی (۳۱) النجم الثاقب فی شرف المناقب تالیف بدرالدین بن عمر بن حبیب (۳۲) منہاج التحقیق ومحاسن التلفیق تالیف یحییٰ بن الحسن قرشی الزیدی (۳۳) الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح للامام تقی الدین ابن تیمیہؒ مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ (۳۴) معالم اُصول الدین لفخر الدین الرازی (۳۵) محصل افکار المتقدمین لفخر الدین الرازی مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ (۳۶) کتاب الارشاد فی اصول الاعتقاد تالیف عبدالملک بن عبداللہ الجوینی ابو المعالی امام الحرمین۔

یہ کچھ ان کتابوں کے نام ہیں جو تین صدی ہجری کے بعد لکھی گئیں۔ اگرچہ یہ کُتب خالص موضوع "اعجاز القرآن" پر نہیں ہیں لیکن پھر بھی اِن کُتب میں اس موضوع پر ضمناً کافی سود مند بحثیں کی گئی ہیں۔ شروع میں کچھ کتب تفاسیر کے نام ہیں اور کچھ کُتبِ علم الکلام کے۔ اِن کتب میں سے بھی اکثر تاہنوز شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ کچھ ان میں سے بھی نایاب ہیں، اور کچھ مخطوطات مختلف کُتب خانوں میں منتشر ہیں۔ متاخرین میں سے ہم نے مصلحتاً کتب کا انتخاب نہیں کیا ہے، ورنہ ایک طویل فہرست تیار ہو جاتی۔ مندرجہ بالا کتب کی فہرست کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ متقدمین میں "اعجاز القرآن" بہت پُر زور مباحث کا موضوع رہا ہے۔ اوائل میں اِس موضوع پر جو کتب لکھی گئی تھیں وہ اطمینان بخش نہ تھیں اور ایک جامع کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جس کو ابوبکر محمد الباقلانی المتوفی ۴۰۶ھ، نے باحسن وجوہ پورا کر دیا۔ یہ کتاب یعنی: "کتاب اعجاز القرآن" مطبوعہ مصر ۱۹۳۰ء اس موضوع پر ایک اہم اور بہترین کتاب ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں یہ بحث کی گئی ہے کہ "قرآن ہی محمدؐ کا معجزہ ہے!" دوسرے باب میں یہ بحث کی گئی ہے کہ "قرآن واقعی معجزہ ہے!" تیسرے باب میں اِس باب سے متعلق تمام موافق دلائل جمع کیے گئے ہیں۔ ایک موقع پر الباقلانی لکھتا ہے کہ قرآن نہ شعر ہے نہ سجع۔ نیز قرآن کریم کا طرزِ ادا ایسا منفرد ہے کہ یہ کسی مخلوق کا نتیجۂ فکر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلاغت کی تشریح کرتے ہوئے الباقلانی نے قرآن سے بیشتر مثالیں پیش کی ہیں اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآن کی تمام باریکیوں کو سمجھنا اور اس کی تمام خوبیوں کو بیان کرنا بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اِس کی تصدیق و توثیق کے لئے کیا ہی عمدہ بات ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

نے کہی ہے :

"پھر فہم قرآن، کوئی سادہ اور بسیط شئے نہیں بلکہ اس کے بے شمار مدارج و مراتب ہیں اور ہر انسان علم کے اس اتھاہ و ناپیدا کنار سمندر سے اپنی فطری استعداد، ذہنی ساخت، طبیعت کی اُفتاد۔ پھر اپنی اپنی سعی و جہد، محنت و مشقت، کد و کاوش اور تحقیق و تجسس کے مطابق حصہ پا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی انسان خواہ کیسی ہی اعلیٰ استعداد کا مالک کیوں نہ ہو اور کتنی ہی محنت و کاوش کیوں نہ کرے، پھر چاہے پوری کی پوری عمر قرآن پر تدبّر و تفکّر میں بسر کر دے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی بھی مرحلے پر پہنچ کر وہ سیر ہو جائے اور یہ محسوس کرے کہ قرآن کا فہم کما حقّہ اسے حاصل ہو گیا!"[1]

اِسی بات کو ڈاکٹر صاحب ایک دوسری جگہ نہایت سُلجھے ہوئے الفاظ میں اس طرح لکھتے ہیں :

"اِس لئے کہ قرآن مجید کے علم و حکمت کے بحرِ زخّار سے ہر طالب علم بہرحال اپنے 'ظرفِ ذہنی' کے عمق اور وسعت کے مطابق ہی حصّہ پا سکتا ہے۔ اور اس کتابِ خیر کا نورِ ہدایت ہر شخص پر اُس کے 'اُفقِ فکر و نظر' کی وسعت کی نسبت ہی سے روشن ہو سکتا ہے!"[2]

ایک مقام پر الباقلانی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خطبوں اور خطوط کو نقل کر کے لکھتا ہے کہ ان میں اور قرآن کے طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم خود اس طرزِ بیان کے مالک نہیں تھے تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس کو من و عن کلامِ الٰہی تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے بعد وہ صحابہ کرامؓ اور دوسرے اسلامی و دورِ جاہلی کے خطیبوں کے کلام سے قرآن کا موازنہ کرتا ہے اور اسی پہلے نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے بعد وہ شعرائے عرب کی طرف توجّہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شعراء کے کلام کا مقابلہ کسی طرح قرآن سے ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ نظم میں طرزِ بیان کی وہ خوبیاں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتیں جو نثر میں ممکن ہیں۔ کیونکہ نظم ردیف اور قافیہ کی کڑی بندشوں میں جکڑی ہوتی ہے، اور نثر اس کے برخلاف پوری طرح آزاد ہوتی

---

[1] مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق ص۳۰ + [2] مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق ص۳۱

ہے۔لیکن پھر بھی وہ اطمینانِ قلب کے لئے بعض شعراء کا مقابلہ قرآنِ کریم سے کرتا ہے۔ امام الشعراء امرء القیس کے کلام کا انتخاب کرتا ہے، بعدازاں اس کی خوبیاں اور برائیاں بیان کرتا ہے۔ پھر قرآن کے طرزِ بیان کی چند خوبیاں بیان کرتا ہے اور فیصلہ اہل بصیرت کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اسلامی شعراء کے کلام کو بھی پیش کر کے مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن اختتام پہ جو نتیجہ نکالتا ہے وہ یہ ہے کہ امام الشعراء یعنی امرء القیس کا کلام جب قرآنِ کریم کے مقابلہ میں نہ ٹھہرپایا تو کجا دوسرے شعراء کا کلام۔ ہم اوپر باقلانی کی مایۂ ناز تصنیف "کتاب اعجاز القرآن" کے مختصر تعارف میں پہلے لکھ چکے ہیں کہ اوّل باب میں بحث کا موضوع یہی ہے کہ "رسولِ خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا معجزہ قرآنِ کریم ہے!" اس سلسلے میں باقلانی لکھتا ہے کہ :

"قرآن کے اعجاز کے سمجھنے کیلئے سب سے زیادہ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بنیاد اسی معجزے پر رکھی گئی ہے۔ اگرچہ دوسرے بہت سے معجزات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن وہ دوسرے تمام معجزات خاص اوقات، خاص حالات اور خاص اشخاص کے پابند تھے .... برخلاف اس کے قرآنِ کریم ایک ایسے معجزے پر دال ہے جو نہ صرف انسانوں کے واسطے ہے بلکہ جنوں کے واسطے بھی یکساں طور پر عام ہے۔ یہ دائمی بقا کا حامل ہے۔ نیز اس کی حجت اس کے ظہور کے وقت سے لے کر روز قیامت تک بجنسہٖ قائم رہے گی!"[1]

اس کے بعد وہ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویؐ سے اس کی بقاء و حجت کا استدلال کرتا ہے۔ ایک مقام پہ وہ اپنے قول کہ : "قرآن کا طرزِ بیان اور اُس کی بلاغت اِس عروج تک پہنچی ہوئی ہے کہ جہاں کسی انسان کی رسائی ممکن نہیں!" کی وضاحت کے لئے دس نکات تجویز کرتا ہے۔ جن میں سے صرف ایک نکتہ یہاں بہ نظرِ اختصار پیش کیا جاتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ :

"فصحاء کے کلام میں فصل و وصل، علو و نزول، تقریب و تبعید میں تفاوت بہت واضح ہوتا ہے۔ خصوصاً ان مراحل پر جب وہ دو مختلف مطالب کو یکجائی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ایسے مراحل پیش آئے ہیں وہاں اتنی صفائی و خوبصورتی کے ساتھ سلسلہ کو قائم رکھا گیا ہے کہ مختلف مؤتلف اور متبائن متناسب محسوس

ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جس کا کلامِ انسانی میں پایا جانا محال ہے !"[1]

بعض متکلّمینِ اسلام نے اعجاز کے شرائط کو سامنے رکھ کر پانچ مقدمات قائم کئے ہیں اور ان سے 'اعجازِ قرآن' ثابت کرنے کی کوشش کی ہے :

"(۱) محمدؐ موجود تھے (۲) وہ مدّعیٔ نبوّت بھی تھے (۳) انہوں نے معجزے کی شکل میں قرآن مجید کو پیش کیا (۴) منکرینِ نبوّت کو مقابلہ کی کھلی دعوت بھی دی تھی۔ (۵) کوئی شخص ان کے معجزۂ قرآن کے مثل کوئی دوسری چیز پیش نہ کر سکا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ان پانچ مقدّمات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یقیناً صادق نبی خدا تھے۔ اوّل [illegible] مقدمات تو مسلّم ہیں۔ بنابریں کوئی بھی آنحضورؐ کے وجود اور ان کے دعویٰ نبوّت سے منکر نہ[illegible]

علی بن عیسیٰ الرّمانی المتوفی ۳۸۴ھ لکھتے ہیں کہ : "اعجازِ قرآن کے مندرجۂ ذیل [illegible] ہیں : (۱) انتہائی کوشش کے باوجود بھی قرآنِ کریم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کسی کو کامیابی نہ ہوئی (۲) دلیل الصرفہ (۳) بلاغت (۴) اخبار بالغیب (۵) (۵) نقض عادات (۶) اور دوسرے معجزات سے مماثلت و مشابہت۔ نقضِ عادت کی وضاحت میں موصوف لکھتے ہیں کہ اس سے مراد کلام کے مروّجہ محاسن، مثلاً شعر، سجع، خطب، رسائل اور نثر وغیرہ ہیں۔ قرآن کا اندازِ بیان اِن سب سے نرالا اور سب سے عالی مقام ہے۔ دوسرے معجزات سے مماثلت و مشابہت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو سمندر کے پھٹ جانے اور عصا کے سانپ بن جانے یا دوسرے ایسے ہی واقعات کی ہے۔ اسی بنا پر کہ یہ بھی اُن ہی کی طرح عادتِ مستمرہ میں داخل نہیں، اسی بنا پر لوگ اس کے مقابلے سے عاجز ہیں[2] !"

علی بن ربن، خطابی اور باقلانی اعجازِ قرآن کے دلائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"کوئی دوسرے الفاظ منظوم ہوں یا منثور، قلبِ انسانی پر کبھی حلاوت

---

[1] کتاب اعجاز القرآن لابوبکر محمد الباقلانی مطبوعہ مصر ۱۹۳۰ء۔

[2] آمدی یحیٰی بن حسن زیدی، قطب راوندی۔

[3] کتاب النکت فی اعجاز القرآن۔

اور کبھی رعب کی وہ کیفیات پیدا نہیں کر سکتے جو قرآن کے الفاظ پیدا کرتے ہیں!" [۱]

بعد کے متکلمین، مثلاً قاضی عیاض، علی الآمدی، شہرستانی، راغب اصفہانی اور ابن حزم وغیرہ نے انہی دلائل کو مزید وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ پس اُن کا اس موضوع پر کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کا محلِ اعجاز کیا ہے ؟ قرآن کا نظم معجز ہے یا اس کے معانی و مطالب ؟ یہ سوالات کوئی نئے نہیں ہیں۔ قدما ر نے بھی ان پر کافی اختلافِ رائے اور مباحث کئے ہیں جو کہ اُن کی تصانیف میں مذکور ہیں۔ ان تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ "آخر میں اجماع اسی پر ہوا کہ دونوں معجز ہیں یعنی نظمِ قرآن بھی اور معانی و مطالبِ قرآن بھی!" نظام 'دلیل الصرفہ' اور 'اخبار الغیب' کو قرآن کا اعجاز بتاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جاحظ 'نظمِ قرآن' کو اعجاز بتاتے ہیں۔[۲] ابوالحسن علی بن علیسیٰ الرمانی 'نظمِ قرآن' اور 'دلیل الصرفہ' دونوں کو ایک ساتھ پیش کرتے ہیں۔ عبدالقاہر جرجانی المتوفی ۴۷۱ھ معانی و بیان کی ترتیب کو 'اعجازِ قرآن' کا ذمہ دار بتاتے ہیں[۳]۔ سید شریف مرتضیٰ 'دلیل الصرفہ' کو اعجاز قرآن بتاتے ہیں۔ علی بن ربّن 'نظمِ معجزہ' کے اختلافی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> "جب میں نصرانی تھا تو میرا اور میرے چچا کا خیال تھا کہ بلاغت نبوّت کی نشانی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہم دونوں صاحبِ فصاحت و بلاغت تھے۔ ہمارا یہ خیال اس بنیاد پر تھا کہ فصاحت و بلاغت تمام قوموں میں مشترک ہے لیکن جب میں نصرانی نہ رہا اور قرآن کے معانی پر تفکر و تدبّر کیا تو مجھے علم ہوا کہ قرآن کا واقعی وہی مقام و مرتبہ ہے جو اس کے ماننے والے بتلاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے کسی زمانے کی کوئی کتاب خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، ہندی ہو یا رومی ایسی نہیں دیکھی ..... اور جس نے نہ کتابت سیکھی ہو اور نہ بلاغت، تو بلاشبہ وہ کتاب اس شخص کی یقیناً نشانیٔ نبوّت ہے!"

---

[۱] القول فی بیان الاعجاز، کتاب النکت فی اعجاز القرآن۔
[۲] کتاب نظم القرآن۔ [۳] کتاب دلائل الاعجاز۔

علی بن عیسیٰ الرمانی اور محمد بن محمد الخطابی کی تصانیف[۱]، جو بلاشبہ چوتھی صدی ہجری میں مکمل ہوئی تھیں، سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ عقیدۂ اعجازِ قرآن اور علم معانی و بیان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جگہ جگہ معانی و بیان کے اصول متعین کر کے اعجاز قرآن کے ثبوت فراہم کئے گئے ہیں۔ یحییٰ بن حمزہ بن علی بھی اپنی کتاب[۲] میں اعجاز قرآن سے بحث کرتے ہوئے سراسر علم معانی و بیان کے مسائل بیان کرتے ہیں۔

اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جو یہ ہے کہ آیا اعجازِ قرآن بیان کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں بھی قدماء کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ حسن بن محمد قمی نیشاپوری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"قرآن کا اعجاز بیان کرنا ممکن نہیں صرف اہلِ ذوق اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اچھا شعر یا حسنِ ملیح کہ اس کی پسندیدگی کے وجوہ بیان نہیں کئے جاسکتے اور اگر کوئی کہتا ہے کہ قرآن کے اعجاز کی وجہ صرفہ ہے یا اس کے اسلوب کا دوسرے اسالیب سے مختلف ہونا یا تناقض سے بری ہونا یا اخبار عن الغیب یا ازیں قبیل کچھ اور تو وہ محض غلط بیانی سے کام لیتا ہے[۳]!"

اسی کے عین مطابق شاہ ولی اللہ دہلوی اور راغب اصفہانی سے بھی روایات منقول ہیں چنانچہ ہر دو حضرات لکھتے ہیں:

"از اں جملہ درجۂ علیا از بلاغت کہ مقدورِ بشر نباشد۔ و چوں مابعد عرب آمدہ ایم بکنہِ آں نمی توانیم رسید۔ لیکن ایں قدر دانیم کہ استعمالِ کلمات و ترکیبات عذبۂ جزلہ بالطاف و عدمِ تکلف قدرے کہ در قرآن می یابیم در ہیچ قصیدۂ از قصائدِ متقدمین و متاخرین نمی یابیم و ایں امر لیست ذوقی کہ مہرہ آں را بخوبی می توانند دانست و عوام ازاں ذائقہ ندارند[۴]!"

"جو لوگ وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے 'اعجازِ قرآن' کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب!" کے مطابق قرآن

---

[۱] کتاب النکت فی اعجاز القرآن و القول فی بیان اعجاز القرآن [۲] کتاب الطراز

[۳] تفسیر قمی برحاشیہ تفسیر طبری مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ جلد ۱ صد ۱۸۱ و بعدہٗ

[۴] الفوز الکبیر لشاہ ولی اللہ صد ۳۸ ؛

کو پڑھ کر ہی اس کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اعجازِ قرآن کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ دو قسم کے اشخاص ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ناقص ہونے کی بناء پر کلامِ الٰہی اور کلامِ بشری میں امتیاز نہیں کر سکتے، اور دوسرے وہ جو نقص کے ساتھ عناد بھی رکھتے ہیں۔[1]"

مفکرین و متکلمینِ اسلام نے زمانۂ قدیم میں ایسے نظریات سے اختلاف کیا تھا اور فدوی بھی ہر سہ حضرات کی مندرجہ بالا آراء سے اختلاف کرنے میں حق بجانب ہے۔ اس واسطے کہ قرآن کا اعجاز کوئی پوشیدہ شئے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی روشن نشانی ہے۔ قرآن خود اِس بات کی شہادت سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۳[2] اور سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۹[3] وغیرہ میں دیتا ہے۔ اگر یہ صرف اہلِ ذوق اور اہلِ بصیرت حضرات کے محسوس کرنے کی شئے ہوتی تو اس کو روشن نشانی ہرگز نہ کہا جاتا۔ ہر غیر مخفی و روشن شئے کے مشاہدہ و بیان پر انسان قادر ہے۔ اور اگر بفرضِ محال اسے مان بھی لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ متقدمین نے اپنی تصانیف میں اس اعجاز کو کس طرح بیان کیا ہے ــــ متقدمین کی خالص اِس موضوع پر تصانیف کی ایک طویل فہرست، جو پچھلے صفحات میں دی جا چکی ہے، اِس بات کی شاہد ہے کہ اعجازِ قرآن کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں تو 'علم معانی و بیان اور 'عقیدۂ اعجازِ قرآن' میں تمیز نہ کی گئی لیکن چھٹی صدی ہجری کے بعد 'علمِ معانی و بیان' کی تصانیف میں اعجازِ قرآن کا ذکر ضمناً یا تمہیداً ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لفظِ اعجاز بھی اپنے مخصوص معنی سے آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا اور آخر کار یہ بلاغت کا مترادف ہو کر رہ گیا اور علم الاعجاز سے علمِ معانی و بیان مراد ہونے لگا۔ نتیجۃً جیسے جیسے 'عقیدۂ اعجاز القرآن' کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی۔ ویسے ویسے لاعلم و 'منکرینِ اعجاز' حلقوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ جب علمائے اسلام ہی اس معجزے کی حمایت سے عاجز ہیں تو اِس سے لازم آتا ہے کہ اس کی حمایت ہی ممکن نہ ہو یا سرے سے اس معجزے کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔ اس لئے تمام اہلِ علم حضرات پر لازم ہے کہ دین کی بنیاد، توحید کا

---

[1] کتاب الذریعہ لراغب اصفہانی صنکہ ؛ [2] هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے) ؛ [3] بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ (دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں)

ستون، اپنے نبیؐ کی دلیل اور اُن کے معجزے کا جو واحد ثبوت ہے اس پر تدبّر و تعقّل کریں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ جہل کا خیمہ وسیع اور اُس کا بازار گرم ہے اور وہ تمام دُنیا میں چھایا ہوا ہے، علمِ دین کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ مُلحدین اسلام پر جو اعتراضات کرتے رہتے ہیں اُس کا بیشتر حصّہ اُن سے پیشتر اہلِ عرب کر چکے ہیں۔ اُن کا مُنہ توڑ جواب دینے کے لئے ناگزیر ہے کہ علومِ جدیدہ کے علاوہ علومِ اسلام کا مطالعہ کیا جائے اور محورِ اسلام یعنی قرآن مجید پر تفکّر و تعقّل کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے متقدّمین کے مناظرے اور تصانیف بھی کافی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

تدبّرِ قرآن سے متعلق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی مایۂ ناز تصنیف میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"قرآن تمام ذی شعور انسانوں کو جنھیں وہ "اُولُوا الْاَلْبَابِ" اور "قَوْمٌ یَّعْقِلُوْنَ!" قرار دیتا ہے تفکّر و تعقّل کی دعوت دیتا ہے اور اُس کا اوّلین میدان خود آفاق و انفس کو قرار دیتا ہے جو آیاتِ الٰہی سے بھرے پڑے ہیں ساتھ ہی وہ اُنہیں آیاتِ قرآنی میں بھی تفکّر و تعقّل کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (یونس - ۲۴)	"اسی طرح ہم کھولتے ہیں اپنی آیات اُن لوگوں کے لئے جو تفکّر کریں!"

● اور فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل - ۴۴)	"اور اُتارا ہم نے تم پر ذکر کہ تم جو کچھ لوگوں کے لئے اُتارا گیا ہے اس کی وضاحت کرو تاکہ وہ تفکّر کریں!"

● اسی طرح:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرہ ۲۴۲)	"اسی طرح اللہ اپنی آیات کی وضاحت فرماتا ہے تاکہ تم تعقّل کر سکو!" ــــ

اِن مندرجہ بالا چند آیات کے علاوہ قرآن کریم میں جگہ جگہ اسی امر کی تعلیم دی گئی ہے کہ اس پر تعقّل و تفکّر اور تدبّر کرو۔ تمام آیات کو جمع کرنا تو دشوار نہیں البتہ اس کے لئے

کافی صفحات درکار ہوں گے بنظرِ اختیار قرآن کے محلِ تدبُّر کی ایک اور آیت ذیل میں پیش ہے!

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (صٓ: ۲۹) [1]	یہ مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ اس واسطے کہ لوگ اُس کی آیات پر تدبّر کریں اور سمجھدار لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر مؤسس مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور اپنی مشہور تالیف: "مسلمانوں[2] پر قرآن مجید کے حُقُوق!" میں اسالیبِ مطالعہ و تدبّرِ قرآن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... قرآن نے خود اپنی مخصوص اصطلاحات وضع کی ہیں اور اپنے خاص اسالیب ایجاد کئے ہیں، جن سے انسان ایک طویل مدّت تک قرآن کو پڑھتے رہنے اور اُس پر غور کرتے رہنے کے بعد ہی مانوس ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ نظمِ قرآن کا فہم بجائے خود راہ کی ایک کٹھن منزل ہے اور مصحف کی موجودہ ترتیب کی حکمت کا علم جو ترتیبِ نزولی سے قطعاً مختلف ہے اور اوّلاً مختلف سُوَر اور پھر ہر سورت کی آیتوں کے باہمی ربط و تعلّق کو سمجھنا ایسا مشکل مرحلہ ہے جس سے بڑے بڑے اصحابِ عزم و ہمّت تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مرحلے کو سر کئے بغیر تدبّرِ قرآن کے حق کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی معدن سے قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کے اصل موتی حاصل ہوتے ہیں اور اسی سے اس بحرِ ناپیدا کنار کی وسعتوں کا اصل اندازہ ہوتا ہے!"

اِلیٰ آخرہٖ [3] !!!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تعقّل و تدبّرِ قرآن کی ضرورت اور اہمیّت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "دَورِ جدید اس معاملے میں (یعنی تجرباتی و نظریاتی علوم مثلاً منطق

---

[1] مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق مؤلفہ ڈاکٹر اسرار احمد، صا۳۱، ۳۲

[2] اس موضوع پر یہ ایک قابلِ قدر تحقیق ہے ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں پر قرآن کے حقوق پانچ بتائے ہیں جن میں سے ایک تدبّرِ قرآن بھی ہے۔ قرآن فہمی، اُس سے ذہنی مناسبت اور قلبی اُنس کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اِن شاء اللہ تعالیٰ مفید ہوگا!

[3] مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق! ص۳۸

فلسفہ، الٰہیات و مابعد الطبیعات، اخلاقیات، نفسیات و معاشیات اور دیگر علومِ عمرانی ملیں) غالباً اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور علومِ متذکرہ بالا کے علاوہ علومِ طبیعی (PHYSICAL SCIENCES) اور فنونِ صنعتی (TECHNOLOGY) نے انتہائی بلندیوں کو چھو کر عقلِ انسانی کو اس طرح مبہوت و ششدر کر دیا ہے کہ ایک عام انسان کے لئے ان کے جلو میں آنے والے غلط نظریات و افکار پر جرح و تنقید قطعاً ناممکن ہو گئی ہے۔ اندریں حالات دَورِ حاضر میں تدبّرِ قرآن کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اصحابِ ہمّت اور اربابِ عزیمت کی ایک بڑی جماعت اپنے آپ کو پوری طرح کھپا کر ایک طرف تدبّرِ قرآن کی متذکرہ بالا جملہ شرائط کو پورا کرے، اور دوسری طرف جدید علومِ عقلی و عمرانی کی گہری اور براہِ راست مہارت بہم پہنچائے اور پھر نہ صرف یہ کہ قرآن کی روشنی میں علومِ جدید کے صحیح و غلط اجزاء کو بالکل علیٰحدہ کر دے بلکہ جدید استدلال اور معروف اصلاحات کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کے قریب ہو کر لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے روشن کر دے تاکہ "لِتُبَيِّنَهُ لِلنَّاسِ" کا جو فریضہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں ادا فرمایا تھا وہ اِس دَور میں آپؐ کی اُمّت کے ذریعے بھی پورا ہو ..... [۱] ..... اِلیٰ آخرہٖ!"

گذشتہ چودہ سَو سالوں سے قرآن کے اعجاز کا مطالعہ و مشاہدہ موجود اُمّت کرتی آرہی ہے مگر تا ہنوز اس پر تدبّر و تحقیق کا جو حق ہے وہ باحسان ادا نہیں ہو سکا ہے اِس لئے ضرورت ہے کہ موجودہ نسل میں سے چند ایسے قرآن کے مدبّر و محقّق پیدا ہوں جو نہ صرف اِس کے اعجاز کا مشاہدہ و اعتراف کریں، بلکہ کثیر التّعداد محسوس و مشہود ثبوت فراہم کریں تاکہ غیر اسلامی نظریات کے مقابلے میں اِن اسلامی افکار کو پیش کر کے اسلام کی حقّانیت ثابت کی جا سکے۔ ثبوت فراہم کرنا دُشوار نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ جلد قرآن کے حق ہونے کی نشانیاں دکھا دے گا: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط (حٰمٓ السجدہ - ۵۳) : ترجمہ "عنقریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں

---

[۱] مُسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق صفحہ ۴۰، ۴۱ ÷

آفاق میں بھی دکھائیں گے اور اُن کے اپنے انفس میں بھی یہاں تک کہ اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے!")

آج دُنیا کا مزاج یہ بن چکا ہے کہ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے وہ کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اب حالات ایسے نہیں رہے ہیں کہ راغب اصفہانی کی طرح محض یہ کہہ کر کام چل جائے کہ قرآن کے اعجاز کی دلیل مانگنے والے یا تو ناقص ہیں یا پھر ناقص اور پرعناد دونوں۔ اگر قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کا معرکہ سر کرنا ہے تو ناگزیر ہے کہ ہم اِن ٹھوس دلائل کی تلاش، جُہد و سعی میں ہمہ وقت منہمک رہیں۔ خدا تعالیٰ اِن شاءاللہ ہمیں کامیابی ضرور عطا فرمائے گا۔

مذکورہ بالا آیتِ قرآن کی روشنی میں اگر ہم اَسرارِ کائنات کے روز بروز انکشافات اور کائنات کی پیہم تسخیر پر سنجیدگی سے غور و خوض کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی مسلسل تحقیق و جستجو کے بعد، اپنے وعدہ کے مطابق آفاق و انفس میں کافی حد تک اپنی نشانیاں دکھا دی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر ایک محقق بلا تعصب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات و تحقیقات کا قرآن کی روشنی میں مطالعہ کرے تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہوگا کہ انہی تمام حقائق کو جو اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے روز بروز منکشف ہو رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آج سے چودہ سَو سال قبل قرآنِ کریم میں بیان فرما دیا تھا۔[1]

---

[1] اس امر کا اعتراف بہت سے غیر مسلم سائنس دانوں نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کے ایک معروف میڈیکل سائینٹسٹ ڈاکٹر مورس بُکیل (DR. MAURICE BUCAILE) نے مورخہ ۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو فرنچ اکیڈمی آف میڈیسن میں اپنے خطاب کے دوران اسی امر کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ شواہد بھی پیش کئے ہیں۔ موصوف نے اپنی اسی تقریر کو دوبارہ مورخہ ۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو کامن ویلتھ انسٹی ٹیوٹ لندن میں اسلامک کونسل آف یورپ کے زیرِ نظم منعقد ہونے والے اجلاس میں پڑھا۔ ان اعترافات نے مغربی سائنس دانوں کو مجبور کر دیا کہ اس موضوع پر مکمل ایک کتاب تصنیف کریں۔ چنانچہ "دی بائیبل - دی قرآن اینڈ سائنس" کے نام سے پہلا فرانسیسی ایڈیشن مئی ۱۹۷۶ء میں سیگر پریس سے شائع ہوا بعد ازاں اُس کا انگریزی ترجمہ امریکن ٹرسٹ پبلیکیشنز سے شائع ہوا، عربی ترجمہ ابھی زیرِ اشاعت ہے ۔

ایک عرصہ سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اسلامی نظریۂ حیات کی کشش اور جاذبیت و تعلیمات کو مغرب کے فلسفیانہ تصوّرات کے مقابلہ میں لاکر پیش کردیا جائے۔ ذیل کے مضمون میں اسی نقطۂ نظر سے اعجازِ قرآن کا مطالعہ اور اس کی تصدیق کی کوشش کی گئی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ قارئین کرام پیشِ نظر مضمون کو ضرور پسند فرمائیں گے۔ ہماری پوری کوشش یہی رہی ہے کہ اس میں کسی اختلافی مسئلہ کو راہ نہ مل سکے۔ تمام کا تمام مضمون خالص سائنس، ٹیکنالوجی، طبیعات و ریاضیات کی روشنی میں قطعیٔ محسوس و مشہود مرتب کیا گیا ہے اور ان تمام کی مدد سے اعجازِ قرآن کو ثابت کیا گیا ہے۔

میری نگاہ میں اسلامک ریسرچ کے لئے یہ عنوان نہایت اہم اور قابلِ تحقیق ہے اگرچہ دورِ حاضر میں فدوی کی اس طرف یہ پہلی کوشش نہیں[1] ہے، لیکن توقع ہے کہ اِن شاء اللہ محبّینِ اسلام اور جامعاتِ اسلامیہ کے اساتذہ و طلباء اس طرف توجّہ مبذول فرماکر اس میدان میں مزید تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھیں گے تاکہ موجودہ پست اور مغربی افکار سے مغلوب معاشرہ کا ٹھوس علمی دلائل (سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیقات) کی بنیاد پر نفسیاتی آپریشن کردیا جائے اور اِس سے قرآن کی حقّانیّت اُن پر منکشف کر دی جائے۔ توقع ہے کہ میری اس استدعا پر ضرور غور کیا جائے گا۔ یہ ریسرچ کے لئے وہ میدان ہے جس کی تشنگی کبھی ختم نہ ہوگی۔ اِس بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ منقول ہیں:

وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا	علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہوسکیں گے
يُخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا	نہ کثرت و تکرار تلاوت سے اس کے لطف
تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ۔ (الحدیث)	میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات

(یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہوسکے گا ——— !!

یقیناً یہ بھی قرآنِ کریم کا ایک محسوس و مشہود معجزہ ہے ؛ (جاری ہے)

---

[1] اس سے قبل ڈاکٹر خلیفہ رشد اسی موضوع پر بزبانِ انگریزی کام کرچکے ہیں جو ٹیکسن ایری زونا ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے۔ مگر میں اُس میں کافی تشنگی محسوس کرتا تھا اس لئے اس کا ترجمہ اس مضمون کے دوسرے حصّہ میں بزبانِ اُردو، جابجا اضافہ کے ساتھ اس غرض سے ہدیۂ ناظرین ہے کہ اُردو دان حضرات بھی موصوف کی اس قابلِ قدر تحقیق سے استفادہ کرسکیں ؛

سنتِ رسول صلّے اللہ علیہ وسلّم کی اہمیت

محمد یونس
جستجو عہ

ربّ العالمین نے انسانوں کی ہدایت وراہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور اُن کے آخر پر سیّد المرسلین کو مبعُوث فرمایا اور اُن پر اپنا کلام بصورت قرآن مجید نازل کیا۔ قرآن پاک فیصلہ کن کتاب ہے اور پیغمبر علیہ السلام کی عملی زندگی قرآنی تعلیمات کے موافق اور منشاء ایزدی کے مطابق تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضہ سے جب آنحضرتؐ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے یہی فرمایا تھا کہ اُن کا اخلاق قرآن پاک ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے اوامر ونواہی کے ذریعے انسانوں کو اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن انسان ان احکام پر عملی اعتبار سے کئی قسم کے عذر پیش کر سکتا تھا اس لئے اللہ تعالےٰ نے حامل قرآن کو قرآن پر عملی نمونہ کے طور پر پیش کر دیا اس طرح ثابت ہو گیا کہ قرآن کی تعلیمات سے روگردانی پر کوئی عذر قابلِ قبول نہیں۔ محبُوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے افلاس، تونگری، صحت وبیماری، سفر وحضر کمزوری وغلبہ، شوہر اور [illegible]، سپہ سالار اور منتظم غرض ہر قسم کے حالات میں معیاری طرزِ عمل چھوڑا ہے جو قرآنی [illegible] بھی پورا کرتا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے بہترین نمونہ بھی ہے۔ خود قرآن پاک لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کہہ کر رسول اللہ کی زندگی [illegible]رین نمونہ بتایا گیا ہے۔

اب تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کو خالقِ کائنات کے مطابق گزار کر خدا کی لافانی نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے طریقِ نبوی کو

اپنانے کے بغیر دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سچ فرمایا ہے حضرت سعدی شیرازی نے۔

؎ خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آنحضرتؐ کی زندگی سے عملی نمونہ نہ ملتا اس لحاظ سے آپ کی پوری زندگی میں انسانی حیاۃ کے تمام تقاضوں کا مکمل اور کامل جواب موجود ہے۔ آپؐ کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکے پیدا ہوئے۔ آپ نے اُن کی پیدائش پر جس طرزِ عمل کو اختیار کیا یقیناً وہ ہی بہترین ہے۔ لیکن حضورؐ کے اُسوۂ کے باوجود اگر کوئی شخص بیٹی کی پیدائش پر دل تنگ اور بیٹے کی پیدائش پر دل شاد ہوتا ہے تو ایسے شخص پر سنت کی اہمیت اور رسالت کا مقام واضح نہیں ہے۔ آپ کی بیٹیاں جوانی کی عمر کو پہنچیں آپ نے اُن کے نکاح کئے۔ لڑکیوں کی شادیاں کرنے والے طریق نبی کو اپنانا چاہیں تو بخوبی اپنا سکتے ہیں۔ آپ کے بچے چھوٹی عمر میں فوت ہوتے رہے۔ آپ نے جس صبر و تحمل کا نمونہ پیش کیا وہ آج اور رہتی دُنیا تک اچھے لوگوں کے لئے راہ نمائی ہے۔ بیٹیوں کے نکاح کے موقعہ پر بے سروپا رسوم کی پابندی اور نام و نمود کی خاطر بے جا تبذیر سنت رسول میں مفقود ہے۔ اسی طرح عزیزوں کی وفات پر مختلف نامور سے دعوتوں کا انعقاد سُنت رسول میں ہرگز نظر نہیں آتا۔ مُردے کو تجہیز و تکفین کے بعد قبر میں اُتارنا۔ پھر قبر بنانا آنحضرت سے سیکھنا چاہیئے۔ آپؐ نے قبریں پختہ بنانے اور اُن پر عمارت کھڑی کرنے سے روکا ہے۔ پھر قبریں پختہ بنانے اور اُن پر عمارتیں بنانے کو باعث ناراضئ رسول نہ سمجھنا بھی عجیب منطق ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں بزرگوں کا اکرام ملحوظ ہے لیکن وہ لوگ یہ چیز بھول جاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی زندگی اکملیت اور جامعیت کے بلند ترین درجے پر واقع ہے اگر بزرگوں (زندہ اور فوت شدہ) کا اکرام ملحوظ ہے تو وہ بھی آپ ہی سے سیکھنا ہے کیا یہ آپ کا فرمان نہیں ہے کہ جس نے ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کی اور چھوٹوں پر رحم نہ کیا وہ ہم میں سے نہیں۔ کیا صحابہؓ آپ کے فرمان سے بے خبر تھے۔ ۳ھ میں جنگ احد کے موقعہ پر آپ کے چچا حمزہؓ شہید ہوئے۔ آپؐ کی پرنم آنکھوں کے سامنے اُن کا کفن دفن کیا گیا اور بنائی گئی۔ وہ قبر نہ پختہ ہوئی اور نہ اُس پر عمارت بنی حضرت حمزہؓ کو آپؐ نے سید الشہدا قرار دیا کیا حضرت حمزہؓ سے بڑھ کر کوئی اکرام کا مستحق ہے۔

زندگی کا کونسا گوشہ ہے جہاں آپ کی ذات والا صفات سے راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ ؏ آپ نے اپنے پروردگار کی عبادت رات کو خلوت میں اور دن کو لوگوں

سامنے کی۔ رات کی عبادت کی کیفیت ازواج مطہرات کی زبانی ہم تک پہنچ چکی ہے دن کی عبادات چشم دید گواہوں نے بتائی ہے۔ فرض نمازوں کے لئے مسجد اور نفل نمازوں کے لئے گھر کو اختیار کرنا سُنت نبوی ہے۔ پھر طریق عبادت قیام۔ رکوع۔ سجود ...دہ میں قرآن کی تلاوت، بندگی کا اقرار، خدا کی کبریائی اور عظمت کا اعتراف اور دعائیں ...۔ یہ طریق نبوی ہے۔ جنگل میں جا کر عبادت۔ مسجد اور جماعت کے بغیر نماز۔ پھل اور ...ی غذائیں چھوڑ کر نکمی اور بھدی غذاؤں کا استعمال۔ جسم کو گندہ اور غلیظ رکھنا۔ ...ے ہوتے بال اور میلے کچیلے کپڑے پہننا۔ پاؤں میں گھونگھرو باندھنا۔ تجرد کی زندگی ...ارنا۔ پانی میں کھڑے ہو کر ورد و ظائف کرنا۔ قبر پہ مجاورت کرنا اور اس کے ...ادہ دوسری مصنوعی عبادتیں جب پیغمبر علیہ السّلام کے اُسوہ حسنہ میں نہیں ہیں تو ...ن میں نفع کی بجائے سراسر نقصان اور خسران ہے۔ کیونکہ ناقص اور ادھوری چیزیں ...اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن مکمل۔ کامل اور جامع ترین شے میں اضافہ اُس کے حسن و ...مال میں نقص کا باعث ہو گا۔ کوئی ایسی خیر، بھلائی یا خوبی نہیں ہے جو پیغمبرؐ کے اُسوہ ...میں نہ ملتی ہو۔

... اُسوۂ حسنہ کا جواب تو ملنا محال ہے۔ آپ کی زندگی کمال کے اُس مقام پر ہے کہ کوئی دوسرا انسان تک نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ آپ کے پیروکاروں نے بھی اس درجہ آپ کی اتباع کی ہے کہ خود آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو! تم پر میرے طریقے کی پیروی اور میرے حق پرست خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔ چنانچہ آپ کے اس فرمان کی روشنی میں جب ہم خلفائے راشدین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اُن بزرگوں کی زندگی بھی اُن ہی نقوش کا مجموعہ ہے جو اُسوۂ حسنہ میں پائے جاتے تھے۔ بیاہ شادی۔ پیدائش و وفات۔ خوشی اور غمی۔ جنگ اور امن میں جو طریقہ آپ نے اپنایا وہی صحابہ کرامؓ نے۔ عبادت جس طرح آپ نے کی اُسی طرح صحابہ نے۔ الغرض خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے دین کی اس کامل اور مکمل صورت کو جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی بالکل اُسی طور پر اپنا لیا اور اس طرح آپ کی نظروں میں قابل اعتماد ٹھہرے۔ انہوں نے اپنی پسند و ناپسند کو قطعاً معیار نہ بنایا بلکہ پیغمبر اسلام کے اسوہ حسنہ ہی کی پیروی کی اور اُس میں کچھ کمی یا زیادتی نہ کی۔

آج کل مادی ترقی کا دور ہے۔ ایجادات نے بود و باش کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس دور کے کچھ چیلنج ہیں لیکن اسلام میں ہر دور کے چیلنج قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے علمائے

وقت ایسے مسائل میں اجتہاد کر سکتے ہیں مثال کے طور پر ریل گاڑی یا ہوائی جہاز میں سفر دوران نماز کی ادائیگی کیسے کی جائے۔ ٹیلیفون پر ایجاب و قبول کا انعقاد وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو زمانہ نبوی اور خلفائے راشدین کے عہد کے بعد کی پیداوار ہیں چنانچہ علمائے عصر جن کو قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم میں دسترس حاصل ہو ان مسائل کا حل بتائیں گے علماء کے اجتہادی اختلاف کی صورت میں کسی مجتہد کا فیصلہ اقرب الی الصواب سمجھ کر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن طریق عبادت اور دوسری تمام باتیں جن میں دربارِ نبوی کا فیصلہ پہلے سے موجود ہو کوئی دوسری راہ اختیار کرنا تو سراسر خسران مبین ہے۔

سُنت رسول اور طریق اجتماع صحابہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا طریقہ معیار قرار نہیں پا سکتا کیونکہ اُسے کوئی سند حاصل نہیں۔ سُنتِ رسول تو خدا کی طرف سے ہے اور طریق صحابہ کو خود رسولؐ نے معیار قرار دیا۔ اب تو وہی شخص اللہ کا مقرب بندہ اور ولی اللہ ہو گا۔ جس کا راستہ بس سُنت رسول اور طریق صحابہ کے مطابق ہو۔ لیکن ایسا شخص بھی اُمّت کے لئے مطاع نہیں ہو گا بلکہ پسندیدہ ہو گا وجہ اُس کی یہ ہے کہ جزئیات تک کامل نمونہ حیات تو صرف انبیاء ہوتے ہیں جن کو معصوم رکھنا مشیت ایزدی سے ہوتا ہے۔

شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنے ابنائے جنس کے کچھ افراد سے اچنبھا اور نرالے کام دیکھ کر اُن کے ساتھ اظہار عقیدت شروع کر دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہی جذبہ شخصیت پرستی تک لے جاتا ہے۔ اس طرز عمل کی شناعت واضح ہے کہ معیاری زندگی تو اتباع رسول میں ہی ہو سکتی ہے۔ اگر نرالے اور اچنبھے کام کر گزرنا بزرگی کی علامت ہے تو یہ علامت سامری میں بھی موجود ہے اور بہت سے غیر مسلم جوگی اور راہب۔ جادوگر اور شعبدہ باز خوارق عادات کے لئے آج بھی مشہور ہیں۔ جن کی زندگیوں میں لہو و لعب کے علاوہ خدا پرستی بھی مفقود ہے۔ پھر ایسے افراد میں بزرگی کس بنیاد پر تسلیم کی جائے۔

شخصیت پرستی گمراہی کی جڑ ہے۔ ہر قسم کی گمراہیاں اور توحید کی خلاف ورزی اسی سے جنم لیتی ہے۔ ابلیس لعین لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے شروع سے آج تک اس ہتھیار کو بڑی کامیابی سے استعمال کر رہا ہے۔ لوگ کسی شخص میں نرالا پن اور شعبدہ بازی دیکھ کر اُسے بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور پھر اُس کے طور و اطوار کو بنگاہِ عقیدت دیکھنے لگتے ہیں یہاں تک کہ اُس بزرگ کی پسند ناپسند کو معیار قرار دے لیتے ہیں۔ مسلمان بھی اس مرض کا شکار نظر آتے ہیں جب وہ اظہار عقیدت میں غلو کرتے ہوئے بعض لوگوں کے طرز عمل کو معیاری قرار دے لیتے ہیں اور اس طرح آنکھیں بند کر کے مطاع حقیقی کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی مجاورت

کو صائب سمجھنے لگتا ہے تو کسی کی نظر میں قوالی بھلی معلوم ہوتی ہے کوئی جنگل میں عبادت
رب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے تو کوئی مجرد رہنے میں بھلائی خیال کرتا ہے۔ گویا پہلے
ایک شخصیت کو بھلا سمجھ لیا اور بعد ازاں اُس کے افعال کو معیاری قرار دیا حالانکہ
حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی خلافِ سُنت رسول عمل کر کے پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ کسی
شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مطاع بن کر لوگوں کو اپنے پیچھے لگالے بلکہ اب ہر شخص کی اپنی بھلائی
اسی میں ہے کہ معراج انسانی کے انتہا تک پہنچ جانے والی ہستی کی پیروی کرے۔

کسی شخص کے حق میں رائے عامہ ہموار ہو جاتی ہے۔ لوگ کسی کی مخالفت پر کمربستہ
ہو جاتے ہیں۔ کسی کو حالات ساز گار ملتے ہیں۔ کسی کی زندگی الجھنوں اور مصیبتوں کا شکار
ہو جاتی ہے۔ کوئی عرصۂ دراز تک بیمار رہتا ہے۔ کسی کو عمر بھر بیماری نہیں آتی۔ کوئی خوبصورت
ہوتا ہے۔ کوئی بدصورت لیکن ان میں سے کسی کو بھی خدا رسیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ
ان میں سے جو شخص بھی سُنت رسول کی پیروی کو مضبوطی سے اختیار کئے ہوئے ہے وہ بہرحال
نیکوکار اور ولی اللہ ہے خواہ اُس کی مخالفت ہو رہی ہے یا موافقت۔ خواہ اُس کے شب
و روز بیماری میں گزر رہے ہیں یا صحت میں وغیرہ۔ الغرض معیارِ حق پرستی نہ رنگ و نسل
ہے نہ دکھ تکلیف۔ نہ آرام و سکون۔ نہ دولت و غربت۔ نہ قبول عام نہ عدم قبول عام
نہ ظہور خوارق نہ عدم ظہور خوارق بلکہ معیار ہے تو صرف اتباع طریق نبوت ہے اور بس اور یہ
معیار کسی انسان جن یا فرشتے کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خود خالق دو جہاں کا بتایا اور بتایا ہوا ہے۔ اس
معیار کے قیام و بقا کے لئے پیش بندی کے طور پر قرآن میں دین کی تمام و کمال جامعیت کے ساتھ
پسندیدگی کا اعلان کیا گیا اور پیغمبر اسلامؐ نے دین میں کمی بیشی کرنے والوں کو مردود گردانا۔
یہی سبب ہے کہ حق شناس مسلمان بزرگوں نے جو کچھ عمل کیا اتباعِ سنت میں کیا اور اپنی کسی
بات یا کسی عمل کو حجت نہ ٹھہرایا جو سُنت میں موجود نہ ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بڑا معروف
ہے کہ اگر میری کوئی بات حدیثِ صحیح کے خلاف ہو تو اُسے دیوار کے ساتھ دے مارو۔

یوں سمجھئے کہ دین حق اور سنت رسولؐ دونوں ایک ہی شے کے دو نام ہیں سُنتِ رسول
کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ خواہ کس قدر چمکدار اور مزین نظر آئے وہ سراب اور دھوکا ہے
صراط مستقیم صرف ایک ہی ہے اور وہ سُنت رسول ہے۔ جس طرح دین کے مقررہ کردہ کلموں
میں کمی کرنا مذموم ہے اسی طرح زیادتی کرنا بھی ناجائز ہے۔ کمی کرنے کی برائی تو واضح ہے
لیکن زیادتی کرنا اس لئے مذموم ہے کہ پیغمبر اسلام کی سُنت کمال کے انتہا پر تو پہلے ہی موجود
ہے۔ زیادتی یا اضافے کا جواز تو وہاں ہے جہاں پہلے نقص ہو اور اس کو دور کرنا مقصود ہو

یا خوب کو خوب تر کرنا منظور ہو لیکن جو چیز خوب ترین ہو اور اُسے خوب ترین بھی خود خدائے بزرگ و برتر نے بنایا ہو اُس میں اضافے کی گنجائش تسلیم کرنا تو سراسر جہالت اور خسران ہے۔ مثال کے طور پر درود شریف کے الفاظ خود آنحضرت نے سکھلا دیئے ہیں۔ اب اپنی طرف سے اگر کسی انسان نے کچھ کلمات تصنیف کر لئے اور اُن کو درود کا نام دے دیا اور اُس کے وظیفے کو مفید تر بتایا تو یہ صرف گمان ہے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے ہزاروں اور لاکھوں کلمات برکت اور فائدے کے اعتبار سے سرورِ کائناتؐ کے بتائے ہوئے ایک کلمے کے برابر تو کجا عُشرِ عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی بات پیدا کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے پس دین میں نئی بات پیدا کرنا اور اُسے بدعتِ حسنہ کہنا دوہرا جرم ہوا۔ اذان کے الفاظ کے اول و آخر الفاظ کا اضافہ۔ نمازِ جمعہ کے بعد کھڑے ہو کر "صلوٰۃ وسلام" کا التزام وغیرہ نہ سنت میں موجود نہ خلفائے راشدین کے عمل میں۔ لہٰذا یہ سب کچھ بدعت ہوا۔ دین اسلام یعنی خدا کا پسندیدہ دین وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کامل صورت میں نبی اکرمؐ پر نازل فرمایا اور رسُول کی صورت میں لوگوں پر مبرہن کر دیا۔ وہی آسان ترین اور سادہ ترین دین ہے۔

کچھ لوگ پُوچھیں گے کہ پھر تو ریل اور ہوائی جہاز کا سفر۔ جنگ میں توپ بندوق اور جدید اسلحہ کا استعمال بھی ناجائز ہوا لیکن یہ بات درست نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق ایجادات سے ہے چونکہ ان کا وجود ہی دورِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں نہیں ملتا اس لئے علمائے مجتہدین کا قول قابلِ قبول ہوگا جو وہ قرآن اور سُنت کی روشنی میں دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اُمت ان کے استعمال کو متفقہ طور پر جائز قرار دیتے ہیں۔ اس وقت اونٹوں اور گھوڑوں کا سفر تھا تو اب جدید ذرائع کے استعمال نے سفر کی سہولتوں کو بہتر اور رفتار کو تیز کر دیا ہے۔ جنگ میں اُس وقت تیر اور تلوار ہوتے تھے۔ اب دشمن کے پاس زیادہ مہلک ہتھیار ہیں تو مسلمان کو بے خبر رہنا اور صرف تیر اور تلوار پر اکتفا مناسب نہیں۔ لیکن ۱۲ ربیع الاوّل کو عید میلاد النبیؐ کا نام دے کر اپنی مرضی کے مطابق اس دن کا پروگرام بنانا یقیناً دین میں اضافہ ہے کیونکہ ۱۲ ربیع الاوّل کا دن نبوی زندگی میں ۲۳ دفعہ آیا اور خلفائے راشدین کے عہد میں ۳۰ مرتبہ آیا لیکن نہ سُنت سے اُسے منانا ثابت ہے اور نہ خلفائے راشدین نے اُسے منایا۔ اگر اس عہد کے ایجاد میں حُبِّ نبی کارفرما ہے تو صحابہ کرامؓ اس سے کیوں غافل رہے جو پیغمبرِ اسلام کے ساتھ حد درجہ محبت رکھتے

ظفر اللہ بیگ ایم اے
(... تاریخ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نظامِ حکومت

حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی کریمؐ کے تربیت یافتہ تھے اور مدینہ میں دولت اسلامیہ کے قیام کے بعد آپ رسول کریمؐ کے خصوصی وزیر اور مشیر بھی رہے چنانچہ آپ تعلیمات نبویؐ کے مجسم پیکر تھے اسی تربیت کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ جب آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دُنیائے اسلام کے خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ نے مدینہ کی اسلامی ریاست کا سیاسی نظام جن خطوط پر استوار کیا وہ نبی کریمؐ کے نظام حکومت کے عین مطابق تھا۔

مشہور مصری مصنف عباس محمود العقاد لکھتے ہیں کہ "اسلامی حکومت نے اگرچہ اپنا نظام موجودہ دَور کے معروف جمہوری نظام کے طرز پر نہیں اٹھایا مگر شخصی نظام حکومت، کلیسائی نظام حکومت انارکزم اور ان تمام نظامہائے حکومت کو باطل قرار دیا جو آج انسان کو شخصی آزادی سے محروم کرتے ہیں" (۱) حضرت صدیق رضؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں صرف خلیفۃ الرسول ہوں اور لوگوں سے فرمایا کہ میرے اندر کوئی کمزوری یا نقص نظر آئے تو اس طرف توجہ دلانا اور مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق کی حکومت موجودہ دَور کی اصطلاح کے مطابق جمہوری حکومت تو نہ تھی مگر آج کل کی ...یت کے سامنے حکومت کی جو غرض و غایت ہے وُہ کس طرح بھی اس غرض و غایت ...لیٰ و اشرف نہیں ہے جو اسلامی حکومت میں مطلوب و مقصود تھی۔

...رت ابوبکر صدیقؓ کا پہلا سیاسی منشور

مسلمان قوم کا امیر اور خلیفہ منتخب ہونے

---

(۱) ...اس محمود العقاد - صدیق کامل - ص ۱۴۱، ۱۴۲ مترجم منہاج الدین اصلاحی

کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی پہلی تقریر میں چند ضروری امور سلطنت اور سیاست کاری کے اہم اصولوں کی جانب توجہ دلائی آپ کا خطبہ دُنیا میں پہلی اسلامی حکومت کے ایک سیاسی منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۱) حکومت کا یہ فرض ہے کہ وُہ جمہور کے فائدے اور بہبُود کا خیال رکھے جمہور کا یہ فرض ہے کہ وہ حتی الامکان حکومت سے تعاون کریں اگر حکومت کی پالیسی عوام کے لئے نقصان دہ ثابت ہو تو عوام کا فرض ہے کہ حکومت کی اصلاح کریں اور حکومت کی غلط روش پر اُسے متنبہ کریں۔

(۲) حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وُہ رعایا کے حقوق کی نگہداشت کرے، کسی طاقتور کو یہ موقع نہ دے کہ وُہ کسی کمزور شخص کے حقوق کو پامال اور غصب کرے عدل وانصاف کے بارے میں حق کا ساتھ دے، کمزور اور ناتواں افراد کو کسی ظلم کا تختۂ مشق نہ بننے دیا جائے، شہری حقوق کی پوری پوری نگہداشت کرنا، عادل حکمران کا اوّلین فرض ہے۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اِس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ اسلامی جمہوریت میں امیر کی اطاعت اس وقت تک فرض ہے جب تک حکمران اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق حکومت کرتا ہے جب حاکم وقت اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو پھر اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی۔ اس تقریر میں اجتماعی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ بدکاری اور بے حیائی کے کاموں کو سختی سے روکا جائے۔

(۴) عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عوام جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کرتے رہیں اگر جذبہ جہاد ختم ہو جائے تو ذلت وخواری قوم پر مسلط ہو جاتی ہے نیز یہ بھی فرمایا کہ ملک وملت کی زندگی کا راز ستیا نہ زندگی اور جذبہ قربانی میں مضمر ہے

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دستور حکومت

اسلامی حکومت یا خلافت کی بنیاد چونکہ قرآن وحدیث پر ہوتی ہے اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش آتا تو سب سے پہلے قرآن مجید میں تلاش کرتے اگر وہاں نہ ملتا تو حدیث کی طرف رجوع کرتے تھے اگر اس خاص معاملہ کے بارے میں حدیث میں بھی کچھ نہ ملتا تو مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب فرماتے ان میں سے اگر کسی کو کوئی حدیث یاد ہوتی اور وُہ پڑھ کر سنا دیتا تو آپ کو بڑی خوشی ہوتی

...ا شکر ادا کرتے کہ سُنت رسولؐ کے جاننے والے ان کی مدد کو موجود ہیں اگر کسی کو کوئی ...یاد نہ ہوتی تو پھر آپ اہل رائے سے مشورہ لیتے تھے (۲)

...وریٰ یا اِسلامی مشاورتی کونسل

صحابہ کرامؓ میں جو حضرات معاملہ فہمی اور تدبر و سیاست میں امتیاز رکھتے ...حضرت ابوبکرؓ نے انہیں اپنا مشیر خاص بنا رکھا تھا جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو ان ...مشورہ کرتے تھے چونکہ قرآن مجیدؐ میں ہے "وامرھم شوریٰ بینھم" (۳) اور مسلمانوں کا کام ...ن کے مشورے سے چلتا ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں "اگر کسی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو ...تے تو ایسی صورت میں ضروری ہے کہ عام لوگوں سے رائے اور مشورہ طلب کر لیا جائے جو ...اب اللہ اور سُنت رسولؐ کے قریب اور مشابہ ہو اور اس پر عمل کیا جائے (۴) ابن سعد کا بیان ...کہ حضرت ابوبکرؓ کو جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تھا، جس میں اہل رائے و اصحاب ...سے مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی تو اس مقصد کے لئے وہ مہاجرین و انصار میں سے کچھ ...وں کو بلاتے تھے جن میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمن ...ن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ شامل ...تے تھے (۵) موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق اسے اسلامی مشاورتی کونسل بھی کہا ...سکتا ہے۔

...ی نظم ونسق

یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت کل دو برس تین مہینے ہے اور یہ مدت بھی اسلامی مملکت کے اندرونی ...یرونی استحکام اور فتوحات میں بسر ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ سلطنت ...ے نظم ونسق سے غافل نہ تھے اور اسلامی مملکت کا رقبہ جتنا وسیع ہوتا جاتا تھا اسی ...ر نظم ونسق کے دائرہ کی بھی وسعت ہوتی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آجکل کی مہذب ...د ترقی یافتہ حکومتوں کی طرح پوری مملکت کو مختلف صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کر دیا ...ا اور ان میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ حاکم مقرر کئے اور مدینہ کو دار الحکومت ...حاصل تھی جو براہ راست خلیفہ کے ماتحت تھا (۶)

...محمد حبیب الرحمن خان شیروانی۔ سیرت صدیقؓ ص - ۸۱

...قرآن مجید۔ سورۃ الشوریٰ آیت نمبر ۳۸

...ابن تیمیہ۔ سیاست شرعیہ۔ ترجمہ محمد اسماعیل گودھروی ص ۲۸۳

...سعد۔ طبقات ابن سعد، قسم ثانی جز ثانی ص ۱۰۹

...محمد اکبر آبادی۔ صدیق اکبرؓ ص ۳۱۹

عہدیداروں کا انتخاب

ایک حکومت کے بہترین نظم ونسق کا انحصار اس پر ہے کہ جس عہدہ کے لئے جس شخص کا انتخاب کیا جائے وہ اس کے لئے موزوں ہو اور اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ زمانہ وقت میں مردم شناسی کا جوہر ہونا چاہیئے مالک بن نویرہ کے مسئلے کے بارے میں خالدؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کو کس قدر شدید اختلاف تھا اور یہ اصرار کر رہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید کو معزول کر دیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنی طرف سے ادا کر کے جھگڑا ختم کیا اور آخر ایک وقت آیا کہ حضرت عمرؓ کو یہ کہنا پڑا کہ صحابہ میں حضرت کے برابر کوئی مردم شناس نہیں۔

اقربا نوازی سے اجتناب

ایک فرمانروا کے لئے یہ سب سے ضروری ہے کہ وہ عہدوں کی تقسیم اقربا نوازی سے اجتناب کرے اور عہدہ اس شخص کو ہی سپرد کرے جو اس کا حضرت ابوبکرؓ خود بھی اس پر سختی سے عمل کرتے تھے اور اپنے عمال کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کی امارت پر روانہ فرمایا تو کہا۔

اے یزید! وہاں تمہارے عزیز واقارب ہیں ممکن ہے کہ تم ان کو امارت کے دینے میں ترجیح دو یہ وہ سب سے بری چیز ہے جس کا میں تم سے اندیشہ کرتا ہوں کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے کسی کام کا ذمہ دار وہ محض رشتہ کی وجہ سے ان پر کسی شخص کو امیر بنا دے تو اس پر اللہ کی طرف سے لعنت ہوگی اور اللہ اس کی طرف سے کسی فدیہ اور کفارہ کو قبول نہیں کرے گا۔ (۷)

عمّال کے تقرر میں تعصّب سے پرہیز

ایک طرف اقربا نوازی سے اجتناب دوسری طرف عالی ظرفی کا یہ عالم تھا اگر کسی شخص کی نسبت یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ آپ کی ذات سے رنجش رکھتا ہے لیکن جو عہدہ آپ اس کو دینا چاہتے ہیں، وہ اس کے لئے موزوں ہوتا تو آپ اس ذاتی رنجش کے خیال کو اس کو عہدہ دینے میں مانع نہیں رکھتے تھے شام کی مہم روانہ کرتے وقت خالد بن سعید کے متعلق حضرت عمرؓ نے مخالفت کی اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ خالد بن سعید آپ کی خلافت سے خوش نہیں تھے اور انہوں نے آپ کے خلاف بنو ہاشم کو بھڑکا

(۷) امام احمد بن حنبلؒ۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد نمبر ا ص ۶

…ی حضرت ابوبکرؓ نے اس کی مطلقاً پرواہ نہ کی اور تقرر بحال رکھا ۔ (۸)

…مت کا احترام

کسی حکومت کے شائستہ اور مہذب ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عمالِ حکومت کا ان کے مرتبہ اور …ے لحاظ سے پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے اور ان کے ساتھ جبر یا زیادتی نہ کی جائے …ت ابوبکرؓ ان دونوں باتوں کا بھی خیال رکھتے تھے جیشِ اسامہؓ کی روانگی کے وقت …ت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ اس جیش میں نہ جائیں اور مدینہ میں رہ کر اُن …وصی مشیر کار کی حیثیت سے کام کریں چنانچہ آپ نے حضرت عمرؓ کے متعلق خود فیصلہ …بجائے امیر الجیش حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو …ت عمرؓ کو ان کے پاس چھوڑ جائیں ۔ دلجوئی کا یہ عالم تھا کہ حضرت اسامہؓ کا لشکر …وا تو حضرت اسامہؓ سواری پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن وقت کے خلیفہ دور تک پیدل …گئے اس طرح یزید بن ابی سفیانؓ شام کی مہم پر روانہ ہوئے تو آپ اُن کو روانہ …کے لئے دور تک پیدل ساتھ گئے ۔

…شی تقرر

آج کل کے عام قاعدے کے مطابق جب کسی شخص کے متعلق اس کی حسنِ کارگزاری کے متعلق یقین نہ ہو جاتا کہ …س عہدے کا اہل ہے تو اس کا تقرر عارضی طور پر کرتے تھے مستقل ہونے اور ترقی …ی شرط حسنِ کارکردگی ہوتی تھی یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کی مہم پر ایک دستہ …کا امیر مقرر کر کے روانہ کیا تو ان کو بہت سی ہدایات دیں ان ہدایات کا آغاز اس …کیا "میں نے تم کو اس لئے والی بنایا ہے کہ میں تم کو آزماؤں، تمہارا تجربہ کروں …م کو ٹریننگ دوں اگر تم نے اچھا کام کیا تو میں اس عہدے پر تم کو برقرار رکھوں گا …ی دوں گا اگر تم نے بُرا کیا تو اس سے علیحدہ کر دونگا (۹)

…نروں کے فرائض

آجکل کی اصطلاح میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حکومت کو فوجی حکومت کہہ سکتے ہیں یعنی جو گورنر یا والی ہوتا تھا وہی …اعلیٰ ہوتا تھا چنانچہ ایک گورنر کے فرائض حسبِ ذیل تھے ۔

…ابن جریر ۔ طبری جلد ۱ ص ۶

…الحلیم شرر ۔ ثانی اثنین ص ۹۳ وحیات صدیق د خالد ۔ مصری علامہ رفیق بک العظم ص ۹۴ جلد ۱

(۱) مسجد میں جماعت کی امامت اور جمعہ کے روز خطبہ دینا۔
(۲) فوج کی نگرانی اور اس کی تنخواہ وغیرہ کا بندوبست کر کے اسے تقسیم کرنا۔
(۳) تمام محصولات کا جمع کرنا اور درآمد و برآمد اشیاء کی نگرانی کرنا۔
(۴) اپنے علاقے میں امن و امان قائم کرنا اور لوگوں کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرنا
(۵) حدود اللہ جاری کرنے کے ساتھ مجرموں کو سزا دینا۔
(۶) فتنہ پروروں کے خلاف جنگ کرنا اور اس میں جو مال غنیمت ہاتھ آئے اسے مسلمانوں میں تقسیم کرنا اور خمس مرکز کو بھیجنا۔
(۷) ہر سال حج کے لئے جانے والے قافلوں کا انتظام کرنا۔
(۸) ضعیف العمر سپاہیوں کو پنشن دینا اور ان کے متعلقین کی معاشی مدد کرنا۔
(۹) کسانوں کا خاص خیال رکھنا اور زراعت کو ترقی دینا (۱۰)

عہدۂ قضا

عام طور پر مشہور ہے کہ قضا کا عہدہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے قائم کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عہدہ خود عہد نبوت میں قائم ہوا تھا کتب حدیث میں ایسی بہت سی روایات اور احادیث منقول ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے قاضی کے فرائض و واجبات، عہدہ کی شرائط اور شہادت کے احکام تفصیل سے بیان فرمائے تھے اگرچہ آخری فیصلہ آپ کا ہی نافذ ہوتا تھا لیکن مختلف علاقوں میں اپنی جانب سے آپ نے قاضی مقرر کر دیئے تھے حضرت علیؓ کو یمن بھیجا اسی طرح معاذ بن جبل کو یمن بھیجا چنانچہ اس طریقے کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد میں حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور بعض صحابہ کو اس خدمت قضا پر مامور کیا چنانچہ کتب تاریخ و سیر میں اُن کو عہد صدیقی کے ارباب افتاء کہا گیا ہے جیسا کہ علامہ سرخسی نے تصریح کی ہے (۱۱)

صدر اوّل میں قاضی کو بھی مفتی کہتے تھے لیکن حضرت عمر فاروقؓ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدہ پر مامور تھے اور اہم معاملات کا فیصلہ خود ہی کرتے تھے چنانچہ طبری میں ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں آپ کے لئے قاضی کا کام کروں گا" (۱۲)

(۱۰) سعید احمد اکبر آبادی - صدیق اکبرؓ ص ۳۲۴
(۱۱) علامہ سرخسی - المبسوط جلد ۱۶ ص ۱۰۹
(۱۲) محمد ابن جریر - طبری جلد ۲ ص ۶۱۷

وزارت عظمیٰ

اگرچہ اس زمانے میں وزارت عظمیٰ کا عہدہ باقاعدہ طور پر نہیں تھا لیکن جہاں تک وزارت کے فرائض کا تعلق ہے وہ حضرت عمر فاروقؓ سے متعلق تھے آپ حضرت ابوبکرؓ کے مشیر خاص اور امور سلطنت میں دست راست تھے اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ ان کو اپنے ساتھ مدینہ میں ہی رکھتے تھے اور کسی مہم پر نہیں بھیجتے تھے۔ تاریخ یعقوبی کے مصنف نے لکھا ہے کہ "آنحضرتؐ نے جیش اسامہؓ میں شرکت کے لئے جن کو نامزد کیا تھا ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے لیکن لشکر کی روانگی سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ اگر وہ فاروق کو مدینہ میں ہی چھوڑ جائیں تو بہتر ہے تاکہ وہ امور حکومت میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھائیں (۱۳)

وزارت خزانہ

بیت المال کا قیام آنحضرتؐ کے عہد میں ہی عمل میں آگیا تھا حضرت ابوبکرؓ نے اس کا انتظام حضرت ابوعبیدہؓ کے سپرد کیا جو بیت المال کی آمدنی اور خرچ کا پورا پورا حساب رکھتے اور اس کی نگرانی کرتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے پوچھا کہ شروع سے اس وقت تک خزانہ میں مال کس قدر آیا ہوگا تو انہوں نے جواب دیا دو لاکھ دینار" (۱۴)

عہدہ کتابت

چونکہ اہم فرامین و احکامات کاتب کو ہی لکھنے ہوتے ہیں اس لئے کتابت کا عہدہ بھی بڑا اہم تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ اس عہدہ کا کام وقتی طور پر ان لوگوں سے لیتے تھے جو ضرورت کے وقت آپ کے پاس موجود ہوتے تھے اس کے علاوہ جو حضرات اس کام پر متعین تھے وہ زید بن ثابتؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ تھے۔ (۱۵)

عہدہ افتاء

شرعی حکم بتانے کے لئے تقویٰ کے علاوہ فقہی تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ محض ایک ایسی دولت ہے خدا جسے چاہے بخش دے ہر عالم دین اس سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا حضرت ابوبکرؓ کے دور میں جو حضرات فقیہہ تھے اس بنا پر یہ عہدہ اُن کے سپرد تھا ان میں حضرت علیؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ

---

(۱۳) احمد بن ابوایوب العباسی - تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۱۴۲

(۱۴) ابن سعد - طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۱۵۱

(۱۵) محمد بن جریر طبری - تاریخ طبری جلد ۲ ص ۶۱۷

اور عبداللہ بن مسعودؓ تھے ان میں سے اکثر اصحاب مجلس شوریٰ یعنی اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن تھے اِن کے علاوہ کسی کو فتویٰ دینے کی اجازت تھی (۱۶)

محکمہ پولیس

روزمرّہ کے لئے مستقل پولیس کی شکل میں کوئی خاص جماعت نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ خیر القرون میں اس کی ضرورت بھی نہ تھی تاہم اگر ضرورت پیش آتی تو فوری طور پر چند بہادروں کو اس کام پہ مامور کر دیا جاتا تھا چنانچہ حبیش اسامہؓ کی مدینہ سے روانگی کے بعد بعض قبائل کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ لاحق ہوا تو حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے یہ کام لیا گیا یعنی حضرت علیؓ مدینہ کی اسلامی ریاست کی پولیس کے انسپکٹر جنرل تھے۔

عمال حکومت کو ہدایات

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب کسی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپتے تو اس کے متعلقہ فرائض ایک ایک کر کے بیان کرتے اور اس سے عہد لیتے کہ وہ اُن پر عمل کرے گا حضرت اسامہؓ کی قیادت میں آپ نے جو لشکر شام کی سرحد پر روانہ کیا تھا تو اس کو روک روک کر دس ہدایات دیں۔ خیانت نہ کرنا، فریب نہ دینا، سرکشی نہ کرنا، دشمن کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹنا، چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ کاٹنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا بکری، گائے، اونٹ کھانے کے سوا ذبح نہ کرنا۔ تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جو تمہارے پاس نعمتیں لے کر آئیں گے تم جب کھانے لگو تو اللہ کا نام لینا تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہوں نے اپنی زندگی عبادت خانوں کے لئے وقف کی ہوگی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ تمہیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے سروں پر شیطان نے گھونسلہ بنا رکھا ہوگا اُسے کاٹ دینا۔ (۱۷) اسی طرح یزید بن سفیان کو جب شام کی طرف روانہ کیا تو یہ ہدایات فرمائیں "تم جب اپنے لشکر کے پاس پہنچو تو خوش خلقی سے پیش آؤ اور بھلائی کے ساتھ اپنے معاملہ کا آغاز کرو، اپنے نفس کی اصلاح کرو تو لوگ تمہارے لئے ٹھیک رہیں گے جب دشمن کے قاصد تمہارے پاس آئیں تو ان کا احترام کرو اور اس کا قیام مختصر رکھو تاکہ وہ تمہارے لشکر سے واپس جائیں تو اس سے باخبر نہ ہوں۔ اپنے بھید کسی پر نہ کھولو بے کار آدمیوں کے پاس نہ بیٹھو، بزدلی نہ دکھاؤ۔ ورنہ لوگ بزدلی دکھائیں گے (۱۸)

---

(۱۶) ابن سعد - طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۱۰۹

(۱۷) محمد ابن جریر - طبری جلد ۲ ص ۴۶۳

(۱۸) ابن اثیر جلد ۲ ص ۲۷۷

عمال حکومت کا احتساب

مفصل ہدایات واحکامات دینے کے بعد کوئی عہدہ دار خواہ کتنا ہی دور اور نظروں سے اوجھل ہوتا حضرت ابوبکرؓ اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھتے اور جہاں اور کوئی نقص نظر آتا فوراً متنبہ فرماتے اور باز پرس کرتے "مہاجر بن ابی امیہ کی نسبت معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک عورت جو مسلمانوں پر سب وشتم کرتی تھی اس کے دانت اکھاڑ دیئے تو فوراً ان کی سرزنش کی اور خط لکھا اور آخر میں تحریر کیا کہ چونکہ یہ تمہارا پہلا جرم ہے اس لئے اب معاف کرتا ہوں ورنہ آئندہ سزا دوں گا" (۱۹) حضرت ابوبکرؓ کو جب حضرت خالد بن ولید کے بارے علم ہوا کہ انہوں نے جنگ یمامہ کے فوراً بعد مجاعہ کی لڑکی سے نکاح کر لیا ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے انہیں سخت تہدیدی خط لکھا فرمایا "اے خالد تیرا دل بڑا بے رحم ہے تو عورتوں سے نکاح ایسے وقت میں کر رہا ہے جبکہ تیرے گھر کے صحن میں بارہ سو مسلمانوں کا خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے۔ (۲۰)

معمولی غلطیوں سے چشم پوشی

ایک فرمانروائے وقت کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ عمال و کارکنان حکومت کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے اور جب کوئی غلطی ہو تو احتساب کرے ساتھ ہی اعلیٰ درجہ کا مدبر ہونا چاہیئے اور اگر ضرورت ہو تو تھوڑی بہت تنبیہ بھی کر دے معمولی معمولی باتوں پر سرزنش کرنا اصول حکمرانی کے خلاف ہے حضرت ابوبکرؓ میں احتساب کی قوت کے ساتھ یہ وصف بھی بدرجہ اتم تھا چنانچہ طبری نے ایک روایت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ اپنے عمال اور کارپردازانِ حکومت پر زیادہ دار وگیر اور خبر گیری نہیں کرتے تھے۔ (۲۱)

عمال کی تنخواہ

عمال و کارکنان کی تنخواہ کا آغاز آنحضرتؐ کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا تنخواہ کی مقدار کے تعین میں عہدہ کی حیثیت اور اس کے ضروری اخراجات ولوازم کی رعایت بھی ہوتی تھی مثلاً گھوڑا۔ ہتھیار اور خادم وغیرہ عتاب بن اسید جو آنحضورؐ کے عہد میں مکہ کے عامل تھے اور عہد صدیقی میں بھی اس

(۱۹) محمد ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۵۵۰
(۲۰) محمد ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۵۱۹
(۲۱) محمد ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۵۰۳

عہدہ پر فائز رہے اُن کو تیس ۳۰ درہم ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ (۲۲)
حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "حضرت ابوبکرؓ لوگوں میں برابر تنخواہ تقسیم کرتے تھے اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے (۲۳)

حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ۔ حضرت ابوبکرؓ شروع ہی سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ منفح ہیں جو تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی اس پر اکتفا کرتے لیکن جب امور حکومت میں مصروفیت بڑھ گئی تو حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے اصرار پر آپ نے بقدر ضرورت اپنی تنخواہ بھی مقرر کرلی۔ یعقوبی کا بیان ہے "آپ تین درہم یومیہ لیتے تھے۔ (۲۴)
ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ چھ ہزار درہم سالانہ لیتے تھے لیکن وفات کے وقت اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ صدیقہ کو وصیت کی کہ یہ رقم بھی ان کی جائیداد فروخت کرکے بیت المال میں جمع کردی جائے۔ (۲۵) اس سے بڑھ کر جمہوری فلاحی گورنمنٹ دُنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

---

(۲۲) عبدالحی الکتانی ۔ التراتیب الاداریہ الکتانی جلد ۱ ص ۲۶۴
(۲۳) حافظ ابن حجر ۔ اصابہ جلد ۲ ص ۱۵۴
(۲۴) احمد بن ابی ایوب ۔ یعقوبی ۔ جلد ۲ ص ۱۵۴
(۲۵) ابوعبیدہ ۔ کتاب الاموال ص ۲۶۷

(بقیہ ص۴۶) سُنتِ رسولؐ)

تھے۔ معلوم ہوا کہ حُبِ نبی کا بہترین مظاہرہ صحابہ نے کیا۔ وہاں نام ونمود شور وشغب اور دکھلاوے کی خاطر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ پس محبت کا نو ایجاد مظاہرہ یقیناً ناقص ہے اور اسی لئے اس کے نتائج میں مفاسد کا ظہور لازمی ہے۔
آج ہمارے لئے بھی صحیح راہ یہی ہے کہ سُنت رسولؐ اور سنت خلفائے راشدین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں اور پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ محبت کرنے کا وہی طریقہ اپنائیں جو تن من دھن کی بازی لگا کر صحابہ کرام نے اپنایا۔

بقیہ اقسامِ شرک از صت۲

: تباہ و برباد ہوگیا دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ" ۔ یعنی آخرت میں انجامِ کار کے لحاظ مال پرست کے نصیب میں تباہی و بربادی اور ہلاکت ہی آئے گی ۔ ایسے شخص کا دنیا میں نام چاہے عبدالرحمٰن ہو لیکن حقیقت نفس الامری میں وہ عبدالدّینار ہے ۔ نام چاہے عبداللہ ہو لیکن اپنے رویّے کے اعتبار سے وہ عبدالدّرہم ہے ۔ اس لئے کہ ایسے شخص کو مال و دولت اور سیم و زر محبوب تر ہوگیا اللہ اور اس کے رسول کی محبّت سے ۔ گویا اس کا اصل مقصود و مطلوب مال ٹھہرا ۔ اور انسان کا جو حقیقی اور اصل مقصود و مطلوب ہو جائے وہی اس کا معبود قرار پاتا ہے ۔ جیسا کہ ہم نفس پرستی کی بحث کے ضمن میں سورۃ الفرقان کی اس آیت کی روشنی میں سمجھ چکے ہیں : اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ؕ یہاں مال پرست کو درہم و دینار کا عبد (بندہ) قرار دیا ۔ اس حدیث میں لفظِ "عبد" خاص طور پر قابلِ غور ہے ۔ یہ لفظ استعمال فرما کر گویا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آگاہ فرمایا کہ مال کی محبّت دل کے سنگھاسن پر اللہ کی محبّت کے برابر آبیٹھی یا اُس سے بھی بالاتر ہوگئی ، تو اس کا مطلب مال کو "معبود" بنانا ہوا ۔ پس معلوم ہوا کہ مال کی ایسی محبّت جو اللہ اور رسول کی محبّت کے تابع نہ ہو بلکہ ذہن و فکر اور سعی و جہد پر قابض اور غالب یافتہ ہو تو یہ درحقیقت شرک فی الحبّ ہے ۔

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ	-/۶ روپے
اسلام کی نشأۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام	-/۱ "
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	-/۲ "
" " " " (عربی)	-/۴ "
عظمتِ صوم	۷۵/- "
علامہ اقبال اور ہم	۱/۵۰ "
راہِ نجات قسم اعلیٰ -/۲ ادنیٰ	-/۱ "
قرآن اور امن عالم	۷۵/- "
دعوت الی اللہ	-/۱ "
آیت الکرسی : ایک نثری تقریر	۲۰/- "
مطالبات دین	-/۶ "

فضائل سیّدنا عمر فاروق

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

کی ایک تقریر جو موصوف نے ۱۲ر جنوری ۹۷ء کی صبح برکت علی اسلامیہ ہال میں

پاکستان سُنی کونسل کے زیرِ اہتمام کی!

---

۱ : تمہید — اللہ کی حمد وثنا اور آنحضرتؐ پر درود وسلام کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ کی عظمت، بلندیٔ سیرت، سطوت وشوکت اور محیّر العقول شخصیت نیز اُن کے عدیم المثال کارناموں اور ظاہری و باطنی کمالات کا ساری دُنیا کے مسلم اور غیر مسلم مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ میں نے گزشتہ ساٹھ سال میں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں شیخینؓ پر جس قدر کتابیں ہندوستان میں مل سکتی تھیں سب نہیں تو اکثر ضرور پڑھ لی ہیں۔ کسی نے ان کو ہدفِ ملامت نہیں بنایا۔ سب بلا استثناء ان کی مدح و ستائش میں رطب اللسان ہیں "OMER WAS THE WILL OF MOHAMMAD" (H.G WELLS)

ولیم میور تو حضرت صدیق اکبرؓ کو آنحضرتؐ کے مخلص فی الدعوۃ ہونے کا ثبوت قرار دیتا ہے ..... انسان کے محاسن!

ایسے بطلِ جلیل اور جامع کمالات کا تذکرہ، ایک گھنٹے میں، محالِ عقلی نہ سہی، محالِ عادی تو یقیناً ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کرسکوں۔

۱۔ ہر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں (۱) ظاہری پہلو (۲) باطنی پہلو۔ چونکہ باطنی پہلو اہم ہوتا ہے اس لیے میں پہلے حضرتؒ کے اس پہلو پر کچھ روشنی ڈالوں گا اس ضمن میں، ماہرِ علومِ باطنی، غواصِ بحرِ حقائق و معارف حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ارشادات پیش کروں گا۔

(۱) مکتوب بنام خواجہ محمد اشرف کابلیؒ "حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کو اگرچہ کمالاتِ محمدی حاصل ہیں اور اگرچہ یہ حضرات ولایتِ مصطفویؐ کے درجات طے کر چکے ہیں؛ تاہم انبیاء سابقین میں سے ان کو بلحاظِ ولایت، حضرت ابراہیمؑ سے اور بلحاظ دعوت حضرت موسیٰؑ سے مناسبت اور مشابہت حاصل ہے۔

(۲) حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم، علی فرقِ مراتب، نبوتِ محمدیؐ کے بار کے حامل ہیں۔ حضرات شیخین کے کمالات، انبیاء کے کمالات کے مشابہ ہیں اور کمالاتِ ولایت، کمالاتِ نبوت کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں۔

(۳) اس حقیر (مجدد الف ثانیؒ) کی رائے میں بلکہ نظر میں شیخین کی شانؓ تمام صحابہؓ میں سب سے الگ اور سب سے نرالی ہے جس میں کوئی صحابی شریک نہیں ہے۔

(۴) اس عاجز کی نظر میں صدیق اکبرؓ، آنحضرتؐ کے ہم خانہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ حضورؐ تو بالائی منزل میں ہیں، صدیق اکبر تحتانی منزل میں ہیں اور حضرت عمرؓ بھی بطفیلِ صدیق اکبرؓ، اسی منزل میں فروکش ہیں۔ باقی صحابہ کو حضورؐ سے ہم شہر ہونے کی نسبت حاصل ہے۔"

(۵) "یہ اربابِ ولایت جبکہ شیخینؓ کی منزل سے اتنے دُور ہیں تو اُن کے کمالاتِ روحانی کا کیا ادراک کر سکتے ہیں؟"

(۶) شیخینؓ کے منازلِ قرب کا کیا ٹھکانا! یہ دونوں بزرگ تو وفات کے بعد بھی آپؐ سے جُدا نہیں ہوئے اور بروزِ حشر آپؐ کے ساتھ ہی اُٹھیں گے۔

ہمت او کشتِ ملت را چوں ابر ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

نیز، حضور قبر مبارک سے اس حال میں اُٹھیں گے کہ دائیں جانب صدیقؓ ہوں گے اور بائیں جانب فاروقؓ۔ جیسا کہ حضورؐ نے خود اس بات کی خبر دی ہے۔ پس اس قرب اور حضوریٔ

دائمی کی وجہ سے افضلیت بھی انہی کو حاصل ہے۔

(۷) امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ہم عہد نبوت میں ابوبکرؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے پھر عمرؓ کو پھر عثمانؓ کو۔ ان تین کے بعد تمام صحابہ کو چھوڑ دیتے تھے لا نفاضل بینھم۔

اسی طرح امام ابوداؤد نے یوں روایت کی ہے کہ جب آپؐ ہمارے درمیان اس دُنیا میں رونق افروز تھے تو ہم کہا کرتے تھے کہ اس امت میں حضورؐ کے بعد افضل ترین حضرت ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ ہیں پھر عثمانؓ "

(۸) حضرات شیخینؓ کو چونکہ مقام نبوت سے زیادہ قرب ہے اور نسبتاً ان پہ کمالِ نبوت کا زیادہ غلبہ ہے اس لیے ان کے کمالاتِ خاصہ تک اُن کی رسائی نہیں ہوسکتی جن کی پرواز صرف مقامِ ولایت تک ہے "

اب یہ ایک FACT ہے کہ سلیم چشتی کی رسائی تو مقامِ ولایت تک بھی نہیں ہے تو وہ مقامِ فاروقی کا ادراک کب کرسکتا ہے اور کیسے کرسکتا ہے ؟

آخر میں دفتر اوّل کے مکتوب ۲۲۹ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ ارقام فرماتے ہیں :

" کسے کہ حضرت امیرؓ را ، افضل از حضرت صدیقؓ گوید از جرگۂ اہلِ سُنت برمی آید "

اب میں حضرت فاروق اعظمؓ کے ظاہری کمالات کا بہت اختصار کے ساتھ تذکرہ کرکے اور اپنے قلبی جذبات کے اظہار کے لیے یہ دو شعر پڑھوں گا۔

ترا چنانکہ توئی ، مردماں کجا دانند
بقدرِ طاقتِ خود می کنند استدراک
دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

بفضلِ خدا میں تذکرۂ خصوصیاتِ فاروقی سے پہلے ایک طویل تمہید باندھ سکتا ہوں ۔
یہ سوانح حیات ۔ لیکن اپنے ضعفِ جسمانی کے پیشِ نظر بلا تمہید، می آیم بر سرِ مطلب :۔
حضرت فاروقِ اعظمؓ کی پہلی خصوصیت : سب صحابۂ کرامؓ مرید رسولؐ ہیں مگر فاروقِ اعظمؓ
رسولؐ ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضورِ انورؐ اللہ سے دعا فرمایا کرتے تھے کہ " اے اللہ!
جہل کو مسلمان کر دے یا عمرؓ کو دولتِ ایمان عطا کر دے"
دوسری خصوصیت :۔ دنیا میں حسب ذیل افراد مشہور فاتح گزرے ہیں۔ ہینی بال،
ر، چنگیز، تیمور اور نپولین، نادر شاہ اور ابدالی دوسرے درجے میں آتے ہیں۔ لیکن
ب فاتحین، ظلم و ستم، قہر و غضب اور قتلِ عام کے مظاہر ہیں یا قہرِ الٰہی کے مجسمے ہیں۔
لیکن فاروقِ اعظمؓ کا دامن ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان کا
ں سالہ دَورِ حکومت دنیا کی پوری تاریخ میں بے نظیر ہے۔ ایک شخص کی مملکت کا رقبہ ۲۲ لاکھ
ربع میل ہے اور کروڑوں روپے سالانہ اس کے قبضے یا دستِ تصرف میں آتے ہیں، لیکن اس کی
یص پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔
تیمور لنگ لعین نے دلی میں ایک لاکھ سے زائد بے گناہ انسانوں کے سروں کا مینار تعمیر
ر دیا اور نادر شاہ کا قتلِ عام تو ضرب المثل بن گیا ہے، لیکن پورے دَورِ فاروقی میں ایک
بے گناہ انسان کا خون بھی نہیں بہایا گیا۔
تیسری خصوصیت :۔ تمام فاتحین نے بنفسِ نفیس میدانِ جنگ میں فوجوں کی کمان
کی مگر فاروقِ اعظمؓ تمام طویل مدتِ خلافت میں ایک مرتبہ بھی شریکِ جنگ نہیں ہوئے۔ مدینے
ہی میں بیٹھ کر تمام فوجوں کو لڑایا اور ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ آپ مسجدِ نبوی میں خطبہ دے رہے
تھے۔ دورانِ خطبہ آپ نے خطبہ بند کر دیا اور باآوازِ بلند فرمایا یا ساریۃ الجبل اس کے بعد پھر
خطبہ شروع کر دیا۔ جب آپ خطبہ ختم کر چکے تو سامعین میں سے ایک نے پوچھا کہ یا امیر المؤمنین!
حضرت ساریہؓ تو اس وقت ملکِ شام میں فوج کی کمان کر رہے ہیں، آپ نے انہیں کیسے پکارا ؟ تو
فرمایا کہ اس وقت اللہ نے میدانِ جنگ مجھ پر منکشف کر دیا تو میں نے دیکھا کہ ساریہؓ کی پوزیشن
جنگی طریقِ کار کی رُو سے غلط ہے۔ (STRTEGY) اُن کے اور پہاڑی کے درمیان

بہت خلاء ہے۔ چونکہ اس بات کا امکان تھا دشمن کا دائیں کاٹ کر پیچھے سے حملہ کر دے یا انھیں گھیرے میں لے لے ۔ اس لیے میں نے انہیں متنبہ کر دیا۔ جب ساریہؓ مدینے واپس آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ ہم نے فاروقؓ کی آواز سُن کر اس پر عمل کیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں اس واقعہ کی بھی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

چوتھی خصوصیت :۔ یہ ساتوں فاتحین عالم نہ متقی تھے نہ پرہیزگار اور نہ عابد شب زندہ دار۔ نہ درویش نہ کسی روحانی مقام سے آشنا۔ تہجد کجا، یہ لوگ نماز سے بھی بے تعلق تھے

لیکن فاروق اعظمؓ ——— HE WAS A CLASS HIMSELF

شاہان و حکمراناں و فاتحین عالم کی صف میں یکتا و یگانہ ہیں جس طرح صدیق اکبرؓ اسی طرح موصوف بھی ظلِ کمالاتِ نبوتِ محمدی تھے۔ افسوس کہ مقامِ ظلیت کی شرح کی فرصت نہیں ہے۔

پانچویں خصوصیت : آپؓ نے دنیا کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی جس میں ایک معمولی صحابی سلمان فارسی، حضرت عمرؓ سے یہ دریافت کر سکتا تھا کہ آپ کا کرتا دو گز میں کیسے بن گیا؛ فاروق اعظمؓ نے اپنے فرزند عبداللہؓ سے کہا "بیٹے! اپنے باپ کی DEFENCE کرو۔ چنانچہ انہوں نے اُٹھ کر بیان کیا کہ میں نے اپنے حصے کا دو گز کا کپڑا اپنے والد کو دے دیا تھا۔ یہ سُن کر سلمان نے کہا میری تسلی ہو گئی۔ اب آپ حکم دیں ہم تعمیل کریں گے۔"

یہ تھی حریت کی وہ رُوح جو فاروق اعظمؓ نے پیدا کر دی تھی۔

چھٹی خصوصیت :۔ آپ کی صفتِ عدالت ہے جس میں دُنیا کے صرف چند حکمران مثلاً نوشیرواں، سلطان نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، شیر شاہ سوری آپ کے دوش بدوش بیٹھ سکتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ آپؓ نے حقیقی فرزند ابوشحمہ پر بھی حد جاری فرما دی تھی اور اسی صدمے سے ان کی وفات ہو گئی۔

اسی لیے مسٹر ایم۔ کے گاندھی نے کانگرسی وزیروں کو جو نصیحت کی تھی (جب ۱۹۳۷ء میں انگریزوں نے ہندیوں کو PROVINCIAL AUTONOMY صوبجاتی خود مختاری عطا کی تھی) اس

GOVERNMENT OF THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE, BY THE PEOPLE

اس اہم نصیحت یہ تھی کہ اے ہندوؤ! تمہیں ساڑھے سات سو برس کی غلامی کے بعد حکمرانی کی نعمت نصیب ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ تم آئین جہانبانی فراموش کر چکے ہو اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ابوبکر اور عمر کے اسوۂ حسنہ کو اپنے سامنے رکھو، کیونکہ دُنیا ابھی تک اُن سے بہتر و برتر حکمران پیدا نہیں کر سکی ہے۔"

واضح ہو کہ یہ مضمون ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کے ہریجن ویکلی میں شائع ہُوا تھا جو گاندھی کے سرکاری گزٹ کا درجہ رکھتا تھا۔

ساتویں خصوصیت : آپؓ نے مملکت اسلامیہ کو واقعی ایک فلاحی مملکت (WELFARE STATE) بنا دیا تھا جس میں ہر شخص کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں (روٹی، کپڑا، دوا اور مکان) مفت حاصل تھیں۔ آپؓ کا یہ ارشاد، آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جو آپ کی طرزِ حکومت کا مظہر ہے : فرمایا "اگر ایک کُتا بھی دریائے فرات کے کنارے بھوک سے مر جائے گا تو قیامت کے دن عمرؓ سے باز پرس ہوگی۔"

آٹھویں خصوصیت : اگرچہ آپ کی قمیص پر ہمیشہ دو تین پیوند لگے ہوتے تھے مگر آپ کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ اکابر صحابہ اور نامور جنگجو اور فاتحین اور سپہ سالار مثلاً حضرت خالد بن ولید سیف اللہ الجبار فاتح عراق اور حضرت امیر معاویہ فاتح شام اور حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر اور حضرت سعد ابن ابی وقاص فاتح ایران آپ کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔

حضرت عمرو بن العاص کے فرزند نے ایک شخص کے بلا وجہ کوڑا مار دیا۔ اُس نے مدینے جا کر بارگاہ فاروقی میں فریاد کی۔ حضرت عمرؓ نے فاتح و حاکم مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کو فرمان بھیجا کہ بیٹے کو ساتھ لے کر فوراً مدینے حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرو۔ یہ باپ بیٹے دونوں لرزاں و ترساں مدینے حاضر ہوئے۔ فاروق اعظم نے مقدمے کی کارروائی سے پہلے یہ حیرت انگیز جملہ ارشاد فرمایا وہ حریتِ فکر کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے "اے عمرو! اللہ نے ہر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تم نے کس کے حکم سے یا کس قانون کی رُو سے، انہیں اپنا غلام بنا لیا؟" اشک ہائے ندامت کے سوا اس سوال کا کیا جواب دے سکتا تھا۔

قیصر روم کا سفیر مدینے میں آتا ہے اور مسلمانوں سے پوچھتا ہے۔ قصرِ شاہی کہاں ہے؟ مسلمان جواب دیتے ہیں ”ہمارے دین میں شاہی سرے سے نہیں تو قصر خارج از بحث ہے۔ ہاں ہم نے ایک مسلمان کو اپنا امیر منتخب کر لیا ہے اور وہ مسجد میں بیٹھتا جہاں ہر شخص بآزادی اُس سے مل سکتا ہے۔ نہ حاجب ہے نہ دربان، نہ چیمبرلین ہے نہ ایڈی کانگ۔ یہ عجیب و غریب اطلاعات سن کر وہ بہت حیران ہُوا۔ القصہ جب وہ مسجد کے دروازے پہ پہنچا تو معلوم ہُوا کہ بیت المال کا ایک اُونٹ گم ہوگیا ہے۔ اس لیے امیر المؤمنین بہ نفسِ نفیس اُسے ڈھونڈنے گئے ہُوئے ہیں۔ ایک مسلمان کی رہنمائی میں وہ سفیر حوالیٔ مدینہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک اُونٹ، درخت کی شاخ سے بندھا ہُوا ہے اور ایک شخص جس کی قمیص پہ پیوند لگے ہُوئے تھے، ایک بوسیدہ ازار (تہ بند) باندھے اُسی درخت کے سایے میں اپنے دائیں ہاتھ کو تکیہ (بالیں) بنائے ہُوئے محوِ استراحت ہے۔ رہنما نے کہا ”یہی ہمارے امیر حضرت عمرؓ ہیں“۔ وہ سفیر تحیّر کی تصویر بن کر رہ گیا۔ کبھی اُونٹ کو دیکھتا تھا اور کبھی بوسیدہ و پیوند زدہ قمیص کو! اُس مسلمان رہنما نے امیر المؤمنین کو جگایا۔ اللہ کا شیر، محمدؐ کا جانشین، اشدّ علی الکفار، یتیموں کا والی، بیواؤں کا خادم، حق کا علمبردار (عمر ابن خطاب) الذی وافق رایٔہ بالوحی والکتاب، عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور سفیر سے پوچھا ”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“ جس سفیر نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار کا جاہ و حشم دیکھا تھا اور بالکل مرعوب نہیں ہُوا تھا، اُس سفیر پہ ایک مردِ مومن کو دیکھ کر ایسی ہیبت طاری ہُوئی کہ تلوار ہاتھ سے چھُٹ کر گر پڑی۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اسے تسلّی دی اور فرمایا ”بالکل مت ڈرو! میں بھی تمہاری ہی طرح ایک فانی انسان ہوں“ یہ سُن کر سفیر کے اوسان درست ہُوئے تو پہلا سوال اُس نے یہ کیا کہ میں اپنی آمد کا مقصد تو بعد ازیں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے یہ بتائیے کہ مجھ پر یہ ہیبت کیوں طاری ہوگئی؟ میں بہت سے بادشاہوں کے درباروں میں جا چکا ہُوں، لیکن کسی دربار میں مجھ پر یہ ہیبت طاری نہیں ہُوئی۔ فرمایا: ”تم پر میری ہیبت طاری نہیں ہُوئی بلکہ اُس ذاتِ بے ہمتا کی ہیبت طاری ہُوئی جس کا میں رُوئے زمین پہ نمائندہ ہوں۔ میں تو بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہوں تمہاری ہی طرح ایک عاجز اور فانی انسان ہوں“ یہ سُن کر اس سفیر کے اوسان بجا ہُوئے۔

مرشد رومی نے اس واقعے کو تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔

ہیبتِ حق است ایں ، از خلق نیست
ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

نویں خصوصیت : آپؓ نے پوری قوم کو فوج بنا کر ہر مسلمان میں (طفل و برنا و پیر) جہاد کی رُوح پھونک دی۔ ہر مولود کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ پیدا ہوتے ہی بچہ "حزب اللہ" میں شامل ہوگیا۔ اس لیے بیت المال سے اس کی تنخواہ بھی مقرر ہوگئی۔ آپؓ نے دس سال میں بارہ لاکھ مسلح مسلمانوں کی فوج تیار کر دی جس میں سے دس لاکھ جنگجو اور دو لاکھ معاونین تھے۔

دسویں خصوصیت : خدمت خلق آپ کا نمایاں وصف تھا۔ مجاہدین کے گھروں پر جاتے تھے اور ان کی بیویوں سے کہتے تھے کہ سودا منگوانا ہو تو میں حاضر ہوں۔ میدان جنگ سے خطوط آتے تو خود تقسیم کرتے تھے! ہر نماز کے بعد صحنِ مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور مسلمانوں سے فرماتے کہ کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ سپاہیوں (مجاہدین) کی بیویوں کے گھر جاتے اور چوکھٹ کے پاس بیٹھ جاتے اور اُن کے خطوط تحریر فرماتے۔

ایک دفعہ آپؓ کوفہ واپس آرہے تھے۔ راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ سواری سے اُتر کر خیمے کے قریب گئے۔ ایک ضعیفہ کو دیکھا۔ اس سے پوچھا "عمر کا کچھ حال معلوم ہے؟" اُس نے کہا "ہاں! شام سے روانہ ہو چکا ہے، لیکن اُس نے مجھے آج تک کچھ نہیں دیا"۔ یہ سُن کر فرمایا "اتنی دُور کا حال عمر کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"۔ اس پر وہ ضعیفہ بولی "اگر وہ رعایا کا حال معلوم نہیں کر سکتا تو خلافت کیوں کرتا ہے؟ یہ سُن کر آپ پر گریہ طاری ہوگیا۔ اور اس عورت کے ساتھ حُسنِ سلوک کیا۔

ایک دفعہ رات کے وقت گشت کرنے نکلے۔ مدینے سے تین میلی کے فاصلے پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر اس عورت نے کہا۔ ان بچوں کو دو وقت سے کھانا نہیں ملا ہے۔ میں نے انہیں بہلانے کے لیے پانی چولھے پر رکھ دیا ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ فوراً بیت المال پہنچے اجناسِ خوردنی ایک بوری میں رکھیں اور خادم سے کہا "میری پیٹھ پر رکھ دو"۔ اُس نے کہا "امیر المومنین! میں کس لیے ہوں؟

بخوشی لے چلوں گا" آپ نے فرمایا ــ مگر قیامت میں میرا بار تم ہرگز نہیں اُٹھاؤ گے ــ" "لاتزر وازرۃٌ وزر اُخریٰ" ــ القصہ سامان لے کر اُس عورت کے پاس پہنچے۔ اُس نے آٹا گوندھا اور ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ نے خود چولھا پھونکا۔ کھانا کھلانے کے بعد عورت نے حضرت عمرؓ سے کہا " امیر المؤمنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ"

گیارھویں خصوصیت : آپ نے تمام (مملکت) ممالک محروسہ میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا نظام قائم کیا۔ اور اس کام کے لیے مبلغین کی تیاری کا پورا انتظام کیا۔ حفّاظ کی جماعت تیار کی تاکہ وہ لوگوں کو قرآن پڑھا سکیں۔ علماء کی جماعت تیار کی تاکہ وہ مسلمانوں کو دین سکھا سکیں۔ چونکہ آپؓ کے سامنے اللہ کا یہ حکم موجود تھا کہ "لا اکراہ فی الدین" اس لیے آپؓ نے مبلغین کو ہدایت کی کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہ بنایا جائے۔ آپؓ کی دینی کوششوں میں اللہ نے یہ برکت عطا کی کہ جو فوج حضرت سعد ابن ابی وقاص کی ماتحتی میں ایران بھیجی گئی تھی اس میں تین سو سے زائد حفاظ تھے آپؓ نے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے لیے مدارس کا اجراء فرمایا۔ تمام بڑے شہروں میں مساجد تعمیر کرائیں۔ آپؓ نے دارالضرب قائم کیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مردم شماری کرائی۔ آپ نے قرآن سے قلبی تعلق پیدا کرنے کے لیے ماہ رمضان میں نماز تراویح کا اہتمام کیا تاکہ اس مبارک مہینے میں (جس میں نزول قرآن کا آغاز ہوا تھا) ہر مسلمان پورا قرآن سُن لے اور تعلیمات سے آگاہ ہو جائے۔ آپ نے ذمیوں کو یعنی غیر مسلموں کو بنیادی شہری اور مذہبی حقوق عطا کیے اور حکم دیا کہ کوئی شخص اُن کے رسوم مذہبی کی ادائیگی سے نہ روکے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ آپ کی معدلت شعاری پر ایک روشن دلیل ہے کہ جب دمشق کے اسقفِ اعظم نے آپ سے کہا کہ آپ کی نماز ظہر کا وقت آگیا ہے، آپ گرجے میں نماز پڑھ لیں باجماعت۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ مناسب نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے میرے بعد مسلمان یہ کہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہاں نماز پڑھی تھی اس لیے ہم بھی پڑھیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ وہ رفتہ رفتہ تمہارے معبد پر قابض ہو جائیں گے۔ اس بات سے آپ کی انصاف پروری اور معدلت شعاری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، چنانچہ آپ نے معبد کے سامنے افتادہ زمین پر نماز پڑھی۔

بارھویں خصوصیت : آپ کو سیاست میں کمال حاصل تھا، کسی فرمانروا کی زندگی میں

اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی ۔ اس کی وجہ ۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ میں مردم شناسی کا مادّہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آپ ہر مہم کے لیے بہترین سپہ سالار کا اور ہر عہدے کے لیے موزوں ترین شخص کا انتخاب کرتے تھے اور اس معاملے میں اپنے اعزہ و اقربا کے ساتھ کوئی نہایت ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کو آپ نے ملک شام کا گورنر مقرر کیا اور بیس سال کے تجارب نے آپ کے انتخاب کی صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ حضرت معاویہؓ عرب کے چار مشہور مدبّروں اور سیاست دانوں میں سے تھے اور اُنہوں نے بیس سال تک اس سرحدی صوبے پر اس دانائی سے حکومت کی کہ قیصر کو کبھی حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی اور سارا ملک خوشحال ہو گیا۔

تیرھویں خصوصیت : اُن کے عزم بالجزم اور اُن کی سطوت کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے سیف اللہ الجبار حضرت خالد ابن ولیدؓ کو معزول کر دیا تو کسی نے دم تک نہیں مارا اور خود حضرت خالد نے، اپنی بے مثال شجاعت اور بے نظیر حربی قابلیت کے باوجود، اُن کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت خالدؓ کی معزولی کا واقعہ ان کی زندگی کا المناک ترین واقعہ ہے۔ وہ خالدؓ جس نے اپنی ۵۸ سالہ زندگی میں ایک سو بیس معرکوں اور چھتیس جنگوں میں حصّہ لیا اور بہت سے SINGLE COMBATS (مبارز طلبی) میں اپنے حریفوں کو مغلوب کیا اور کبھی ساری عمر اُن کی پُشت تیغ یا سنان کے زخم سے آشنا نہ ہوئی جنہوں نے اپنے ایک حریف کو اپنے دونوں بازوؤں میں دبا کر ملکِ عدم کو پہنچا دیا، وہ خالد جس نے کسی معرکے میں شکست نہیں کھائی ۔ وہ خالد جس نے جنگِ موتہ میں آٹھ گھنٹے مسلسل تیغ زنی کی اور اس عرصے میں آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئیں ۔ وہ خالد جس کا نام سُن کر سچ مچ شیروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا ۔ اُنہوں نے اُسی خالد کو عین اُس وقت معزول کر دیا جبکہ اُن کی شہرت، عظمت، سپہ گری، تیغ زنی اور فتوحات کا آفتاب نصف النہار پر تھا، لیکن اُنہوں نے ان کے حکم کے سامنے ایک معمولی سپاہی کی طرح سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس ایک واقعے سے ہیبت و سطوت و شوکت و عظمتِ فاروقی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

چودھویں خصوصیت : آپؓ نے عدل و انصاف کے تقاضوں کے پیشِ نظر بڑی

سے بڑی شخصیتوں کو نظر انداز کر دیا۔ مثلاً جبلہ ابن ایہم غسانی جو اپنے علاقوں کا حکمران تھا، اسلام لانے کے بعد طواف کر رہا تھا، اتفاقاً کسی کا پاؤں اس کی زرتار قبا پر پڑ گیا۔ اس کی نظر میں یہ فعل بہت بڑا جرم تھا کہ کوئی شخص بادشاہ کی قبا کو پامال کر دے، چنانچہ اُس نے اس شخص کے مونہہ پر طمانچہ مار دیا۔ اس کے جواب میں اس شخص نے جبلہ کے مونہہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا جس پر جبلہ آپے سے باہر ہو گیا مگر کچھ سوچ سمجھ کر حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی توہین کی داستان سُنائی۔ آپؓ نے جبلہ سے کہا کہ "بھائی ہمارے دین میں مساوات کا قانون نافذ ہے۔ تم نے غلطی کی، اُس نے اُس کی سزا تمہیں دے دی"۔ جبلہ نے کہا ہمارے یہاں تو یہ قانون ہے کہ بادشاہ کی توہین کی سزا قتل ہے۔ آپؓ نے فرمایا مگر ہمارے یہاں سرے سے بادشاہ کا وجود نہیں ہے۔ ہم سب مسلمان ہیں اور سب برابر ہیں۔ اگر بادشاہ مسجد میں دیر سے آئے گا تو اسے بھی پچھلی صفوں میں کھڑا ہونا پڑے گا"۔

یہ سُن کر جبلہ قسطنطنیہ چلا گیا اور وہاں جا کر دوبارہ عیسائی ہو گیا۔ مگر فاروق اعظمؓ نے اس کے لیے اسلام کے قانونِ مساوات میں کوئی لچک پیدا نہیں کی۔

پندرھویں خصوصیت: تنخواہوں کے معاملے میں آپؓ نے غلام اور آقا دونوں کو برابر کر دیا بلکہ جو لوگ "السابقون الاوّلون" میں تھے ان کا مرتبہ اور بڑھا دیا۔ اسی لیے اُسامہ ابن زیدؓ کی تنخواہ اپنے سگے بیٹے سے زیادہ مقرر کی۔ اُنہوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا۔ "آنحضرت صلعم اسامہؓ کو تم سے عزیز رکھتے تھے، اور اس کے باپ کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی طرح مہاجرین کو بعد الفتح، اسلام لانے والوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اعیانِ قریش اور دو آزاد شدہ غلام آپ سے ملنے آئے تو آپ نے غلاموں کو پہلے باریابی عطا فرمائی۔

سولھویں خصوصیت: تقرر کے وقت صرف اہلیت اور موزونیت کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ ذاتی تعلقات اور رشتہ داری کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے۔ آپؓ میں مردم شناسی کا ملکہ بدرجۂ اتم موجود تھا اور آپ کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ آپؓ نے حکومت کی کل میں نہایت موزوں پُرزے استعمال کئے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ستائش ہے کہ آپؓ نے کبھی اپنے قبیلے کے لوگوں کو اُونچے عہدے نہیں دیئے محض اس لیے کہ ان میں اس کی اہلیت نہیں تھی

سیاست، تدبر اور انتظام و انصرام ملکی میں تمام عرب میں چار اشخاص اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حضرات امیر معاویہؓ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور زیاد ابن سمیہ؛ چنانچہ آپ نے ان چاروں کو بڑی بڑی ملکی خدمات سپرد کیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان لوگوں کے سوا شام، مصر اور عراق پر اور کوئی شخص اس کامیابی کے ساتھ حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ عمرو بن معدی کرب اور طلیحہ ابن خالد اگرچہ پہلوانی اور سپہ گری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن فوجوں کی کمان نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہیں سپہ سالار کبھی نہیں بنایا۔ عیسائی مؤرخوں نے بھی آپ کے حسن انتخاب کا اعتراف کیا ہے۔

سترھویں خصوصیت : آپؓ نے محکمۂ اطلاعات قائم کیا تاکہ آپ کو تمام صوبوں کی سیاسی اور معاشی حالت کا صحیح علم حاصل ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو گھر بیٹھے دمشق اور کوفے کے حالات کا علم حاصل ہوتا رہتا تھا۔ مشہور شیعہ مؤرخ طبری لکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ مثلاً عراق کے ایک معرکے میں امیر لشکر (سپہ سالار) نے عمرو ابن معدیکرب کو قاعدے کے مطابق دوہرا حصہ نہیں دیا (سوار کا حصہ دُگنا ہوتا تھا) انہوں نے وجہ پوچھی تو امیر نے کہا کہ تمہارا گھوڑا دوغلا ہے۔ معدیکرب کو اپنی پہلوانی پر ناز تھا۔ اس لیے جواب میں یہ سخت جملہ کہہ دیا "ہاں دوغلا ہی دوغلے کو پہچان بھی سکتا ہے"۔ جب امیر لشکر کے ساتھ اس گستاخی کی اطلاع آپؓ کو پہنچی تو آپؓ نے فوراً معدیکرب کو خط لکھا کہ آئندہ ایسی گستاخی ہرگز مت کرنا ورنہ سزا سے نہ بچ سکو گے۔ آپؓ کی بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ کوئی گورنر آپ سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ طبری لکھتا ہے کہ اُن کے گورنر آپ سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتے تھے۔ اس بات سے قارئین شوکت و سطوتِ فاروقی کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اٹھارھویں خصوصیت : آپ کو اس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ مبادا مسلمانوں کے عقیدۂ توحید خالص میں کوئی ضعف رُونما ہو جائے اور یہ صفت آپ میں اس لیے نمایاں تھی کہ آپؓ، آنحضرت صلعم کی شانِ نبوت کا مظہر اتم تھے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اُس درخت کی زیارت کرنے جانے لگے ہیں جس سے ٹیک لگا کر آنحضرت صلعم نے بمقام

حدیبیہ، پندرہ سو عاشقوں سے موت پر بیعت لی تھی تو آپؓ نے خود جاکر اس درخت کو کاٹ کر پھینک دیا اور حکم دیا کہ کوئی شخص اس کی زیارت کو نہ جائے۔

میں یہ لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ پاکستان کے مدعیانِ اسلام ذرا اس آئینے میں اپنی شکل دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ انہیں حضرت فاروق اعظمؓ سے کوئی نسبت ہے؟ اگر یہ درخت کسی صورت سے لاہور میں آجائے تو یہاں کے فرزندانِ توحید اور دخترانِ ملت دونوں مل کر اُسے ہر سال سولہ من گلاب کے عرق سے غسل دیا کریں گے اور بیش قیمت کمخواب کی چادر اس کے چاروں طرف لپیٹ کر اسے بوسہ دیا کریں گے۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال یا سوال پیدا ہو کہ میں نے ۱۶ من گلاب کی کیوں تخصیص کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پچھلے ماہ لاہور کے مسلمانوں نے شیخ علی ہجویریؒ کی قبر کو صرف آٹھ من گلاب کے خالص عرق سے غسل دینے کی سعادت حاصل کی ہے ۔۔ تو وہ درخت کم از کم سولہ من عرق گلاب کا مستحق تو ضرور ہوگا۔

انیسویں خصوصیت : ان کی سادگی تھی اور سادہ زندگی تھی وہ اکثر پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے تھے۔ ان کی قمیص میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ زمین پر سو رہتے تھے، مہینوں گیہوں کا آٹا نہیں ملتا تھا۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو تجارت کا مشغلہ قدرتی طور پر ختم کرنا پڑا۔ ایک آدمی ایک وقت میں یا تجارت کر سکتا ہے یا حکومت، چنانچہ صحابہؓ کو جمع کر کے اپنی ضروریات بیان کیں۔ صحابہؓ نے معمولی درجے کی خوراک اور معمولی لباس مقرر کر دیا۔ جب ایران فتح ہوا اور بدریوں کے وظائف مقرر ہوئے تو ان کا بھی پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔

بیسویں خصوصیت : حضرت فاروق اعظمؓ " اشدآءعلی الکفار رحماء بینھم " کی مجسم تصویر تھے۔ ایک طرف آپ نے فتح بدر کے بعد حضورؐ کو یہ مشورہ دیا کہ اسیرانِ بدر کا فدیہ قبول نہ کیا جائے، بلکہ سب کو قتل کر دیا جائے تاکہ دشمنانِ اسلام کا زور ٹوٹ جائے اور کفار کے دلوں پر اسلام کی ہیبت طاری ہو جائے (جو مطلوب باری ہے)، تو دوسری طرف یہ رحمدلی ہے کہ ایک دفعہ رات کو گشت کر رہے تھے۔ ایک بدو اپنے خیمے سے باہر بیٹھا ہوا تھا اُس سے باتیں کرنے لگے۔ دفعتہً رونے کی آواز آئی ۔۔

دریافت کرنے پر بدّو نے کہا میری بیوی اس وقت درد زہ میں مبتلا ہے اور تنہا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ گھر واپس آئے اور اپنی زوجہ اُمّ کلثوم (بنتِ علی ابن ابی طالب) کو ساتھ لیا اور بدّو کی اجازت سے خیمے میں بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُمّ کلثوم نے شوہر کو پکارا کہ امیرالمؤمنین! اپنے دوست کو مبارکباد دیجئے! بدّو یہ لقب سُن کر چونک پڑا اور مؤدب ہو بیٹھا۔ آپ نے فرمایا کچھ خیال مت کرو تم میرے بھائی ہو۔ کل صبح میرے پاس مسجد نبوی میں آنا میں بچے کی تنخواہ مقرر کردوں گا۔"

جس سال عرب میں قحط پڑا، ان کی حالت عجیب ہوگئی۔ جب تک قحط رہا۔ آپ نے گوشت، گھی اور مچھلی کوئی لذیذ چیز نہ کھائی اور بڑے خضوع اور خشوع سے دعائیں مانگتے تھے کہ یا اللہ! میری شامتِ اعمال کی پاداش میں محمدؐ کی امت کو تباہ مت کیجو۔

چونکہ آپ کا معدہ جوار اور مکئی کی روٹی ہضم نہیں کرسکتا تھا اس لیے مرضِ اسہال لاحق ہوگیا۔ طبیب نے شہد تجویز کیا۔ بیت المال آپ ہی کے قبضے میں تھا اور کنجی بھی آپ ہی کے پاس تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے صحابہ سے شہد لینے کی اجازت طلب کی — بس یہی احتیاط تھی جس کی بناء پر بنی ہاشم کو آپ کے خلاف لب کشائی یا اعتراض کی جرأت نہ ہوسکی۔ بدقسمتی سے بنی ہاشم اس غلط فہمی میں مبتلا تھے اور مدتوں تک مبتلا رہے کہ خلافت ہمارا خاندانی حق ہے کیونکہ ہم آنحضرتؐ کے قریبی رشتے دار ہیں۔ حضرات فاطمہؓ اور علیؓ اس غلط فہمی کا خصوصاً شکار رہے؛ چنانچہ علیؓ نے فاطمہؓ کی زندگی میں حضرت صدیقؓ اکبر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی (تفصیل کے لیے دیکھو بخاری)

اس موقع پر میں سید الشہدا امام مظلوم حضرت عثمان غنیؓ کی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کا تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی قحط کے زمانے میں، اُن کے چار ہزار اونٹ گیہوں سے لدے ہُوئے مدینے پہنچے۔ مدینے کے تاجر اُن کے پاس آئے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا میں HIGHEST BIDDER کے ہاتھ فروخت کروں گا؛ چنانچہ تاجروں نے بولی دینی شروع کی۔ جب بولی چار گنی ہوگئی اور اس پر بھی حضرت عثمان راضی نہ ہُوئے اور کہا مجھے اس سے بھی زیادہ کا OFFER مل چکا ہے تو تاجروں نے حیران ہوکر پوچھا۔

جناب! مدینے کے سارے آڑھتی تو یہاں جمع ہیں، وہ تاجر کون ہے جس نے ہم سے زیادہ رقم کی پیش کش کی ہے تو اس مردِ مومن اور شہید اعظمؓ نے سنجیدگی سے کہا "اللہ" جس نے مجھ سے ایک کے ستر عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے" یہ کہہ کر آپؓ نے تمام گیہوں خلیفۂ رسول امیرالمؤمنین عمر فاروقؓ کی خدمت میں بھیج دیئے کہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ یہ وہی عثمان، وہی ذوالنورین، جامع الفرقان ہیں جن کو پیروانِ ابنِ سبا نے چالیس دن سے زیادہ پانی سے محروم رکھا اور دن دہاڑے مسلمانانِ مدینہ خصوصاً حضرات علی وطلحہ و زبیر کی موجودگی میں گھر میں گھس کر بحالتِ تلاوتِ قرآن نہایت بیدردی اور شقاوت کے ساتھ شہید کر دیا۔

بہر حال آمدم برسرِ مطلب۔ سعد بن یربوع ایک صحابی تھے جن کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ ایک دن آپؐ نے ان سے پوچھا کہ آپ جمعے میں نہیں آتے؟ اُنہوں نے کہا میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے۔ یہ سُن کر آپؐ نے ان کے لیے ایک خادم مقرر کر دیا۔

ایک دفعہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا "جنگ موتہ میں میرا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔ یہ سُن کر آپ پر رقت طاری ہوگئی اور اس کے لیے ایک خادم مقرر کر دیا۔

اکیسویں خصوصیت: آپ نے ساری عمر توحیدِ خالص کی تعلیم دی اور شرک کی ہر صورت مثلاً شرک فی الذات، شرک فی الصفات، شرک فی الحکم، شرک فی العبادۃ، شرک فی الآثار وغیرہ کو مٹا دیا۔ چنانچہ جب آپ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے تھے تو زبانِ حق ترجمان سے یہ ضرور کہہ دیتے تھے کہ اے حجرِ اسود! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے، تجھ میں نہ کوئی طاقت ہے نہ تاثیر مگر میں تجھے اس لیے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے اپنے آقا آنحضرت صلعم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔

بائیسویں خصوصیت: آپ دُنیائے اسلام میں پہلے امام ہیں جنہوں نے علم اسرارالدین کی بنیاد رکھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ کی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" آپؐ ہی کی اولین مساعی کا ثمر ہے۔

تئیسویں خصوصیت: "آپؐ نے مسلمانوں کو حریتِ کاملہ ضرور عطا فرمائی مگر

ہیبت وسطوتِ فاروقی میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دی ۔ بظاہر یہ بات ـــ اجتماع حریت وسطوت ـــ اجتماع ضدین کا مصداق معلوم ہوتی ہے مگر آپؓ نے اپنی فوق العادۃ روحانی اور اخلاقی قوت کی بنا پر یہ محال کو ممکن کرکے دکھا دیا ۔

حریت کا یہ عالم ہے کہ ایک معمولی مسلمان ـــ سلمان فارسیؓ ـــ آپ کو سرِ منبر ٹوک سکتا ہے اس کے باوجود آپ کی سطوت کی یہ شان ہے کہ حضرات معاویہؓ و مغیرہؓ و عمرو بن العاصؓ اور سعد ابن ابی وقاصؓ جیسے بلند پایہ صحابہؓ اور ارباب حل و عقد، آپ کے سامنے لرزہ براندام رہتے تھے ۔ ایک انگریز مؤرخ نے (جس کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے) نے کیا خوب لکھا ہے ۔

"عمرؓ کے دُرّے میں وہ طاقت اور قوت اور ہیبت تھی جو دوسروں کی تلوار میں بھی نہیں تھی ۔"

سعد ابن ابی وقاص فاتح ایران بھی تھے اور عشرۂ مبشرہ میں بھی تھے اور سرکارِ دوعالم اُن کے لیے اپنے والدین کو بھی جمع کر چکے تھے ـــ جس پر انہیں تادمِ زیست ناز رہا ۔ جنگِ اُحد میں ـــ مگر جب اُن سے ذرا سی کوتاہی سرزد ہوئی تو اُنہیں فوراً معزول کر دیا اور اُنہوں نے سطوتِ فاروقی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا چپکے سے چارج دے کر گھر آکر بیٹھ گئے ۔

۲۲۔ چوبیسویں خصوصیت : توحید کے معاملے میں ان کی نگاہ اتنی دُور رس تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ۔ جب اُنہوں نے حضرت خالدِ جانبازؓ کو معزول کیا تو سب مسلمانوں کو رنج ہوا اور ایک میرے جیسے جذباتی مسلمان نے اُن کو یوں مخاطب کیا :

"واللہ ماعدلت یا عمر! لقد نزعت عاملا استعملہ رسول اللہ و غمدت سیفا سلۃ رسول اللہِ ولقد قطعت الرحم وحسدت ابن العم"

حضرت فاروق اعظمؓ کا ظرف اور تحمل دیکھو ۔ اُسے کچھ نہیں کہا صرف اتنا کہا کہ میں جانتا ہوں اس وقت تمہیں اپنے بھائی کی حمایت میں غصہ آگیا ـــ لیکن اس کی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ اُنہوں نے ایک شاعر کو دس ہزار روپے انعام دے دیئے تھے ۔ اصلی وجہ وہ تھی جس کا اظہار خود اُنہوں نے بذریعہ سرکاری فرمان کر دیا تھا ۔

" میں نے خالدؓ کو ناراضی یا خیانت کے جرم میں موقوف نہیں کیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ لوگ اُن کے معتقد ہوتے جارہے تھے اور اُن کی طرف زیادہ مائل ہوتے جارہے تھے میں ڈرا کہ مسلمان خدا کو چھوڑ کر کہیں ان پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں اور اس طرح شرک فی التصرف میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ میں مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ کامیابی خالد کی تلوار کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی کی بناء پر ہے "

اللہ اکبر! کس قدر دُور رس نگاہ تھی مرادِ رسُول کی!

پچیسویں خصوصیت : آپؓ نے فن حدیث اور فقہ کی بنیاد ڈالی۔ آپؓ ہی کی قائم کردہ بنیادوں پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے اور امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعی نے فقہ کے اصُول مستنبط کئے۔ ان دونوں علومِ شرعیہ کا سرچشمہ حضرت فاروق اعظمؓ ہی کی ذاتِ والاصفات ہے۔ قلتِ وقت کی وجہ سے میں اس موضوع کی وضاحت سے قاصر ہوں۔ HIGHLY TECHNICAL

چھبیسویں خصوصیت : بعض موقعوں پر خود وحی الٰہی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ مثلاً مسئلہ اسیرانِ بدر، حجابِ ازواجِ مطہرات اور نمازِ جنازۂ منافق وغیرہ۔

ستائیسویں خصوصیت : عربوں میں جتنے اوصاف ثنائے شرافت و سرداری سمجھے جاتے تھے وہ سب کے سب حضرت عمرؓ میں موجود تھے۔ مثلاً قد و قامت، وجاہت ظاہری، قوتِ جسمانی، فصاحت و بلاغت، خطابت، شاعری، نسّابی، سپہگری، پہلوانی، شجاعت دبدبہ وغیرہ۔ تقریر اور خطابت کا ملکہ پہلوانی کی طرح خداداد تھا۔ مختلف وقتوں میں جو خطبے اُنہوں نے دیئے وہ آج بھی موجود ہیں۔ ان سے ان کے زورِ خطابت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے اور جو صدہا فرامین اُنہوں نے مختلف سرداروں اور گورنروں کو لکھے وہ بھی محفوظ ہیں۔ اُن سے اُن کی انشاپردازی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں۔

اللّٰھُمَّ انی غلیظٌ فلیّنی، اللّٰھُمَّ انی ضعیفٌ فقوّنی۔

پھر عرب قوم سے خطاب کرتے ہیں: "بیشک اہلِ عرب سرکش اونٹ کی طرح ہیں

مہار میرے ہاتھ میں دی گئی ہے اور میں ان کو صحیح راستے پر چلا کر ہی چھوڑ دوں گا۔ خواہ ... ہو جائے۔"

اور آپؓ کے دس سالہ عہدِ خلافت نے آپ کی پیش گوئی کی صحت و صداقت پر مہر ثبت کر دی۔

اٹھائیسویں خصوصیت : آئینِ جہانبانی اور اصولِ کشور کشائی کے ساتھ ساتھ اللہ نے آپ کو علمی اور ادبی ذوق بھی بدرجۂ اتم عطا فرمایا تھا۔ آپ اچھے شعر کے بہت بڑے ناقد تھے۔ آپ کو زہیر ابنِ ابی سلمیٰ، نابغۂ ذبیانی اور امراء القیس کے صدہا اشعار حفظ یاد تھے۔ انہیں تمام شعراء کے کلام پر عبور حاصل تھا، لیکن وہ ان میں مذکورہ بالا شاعروں کو بہت پسند کرتے تھے۔

انتیسویں خصوصیت : آپؓ علم الانساب میں بھی مہارت تامّہ رکھتے تھے اور صحابۂ کرامؓ میں صرف آپ ہی عبرانی اور سریانی زبانوں سے واقف تھے۔

تیسویں خصوصیت : آپ ہی کی رائے اور مشورے سے حضرت صدیق اکبرؓ نے قرآن مجید کو ایک مجلد یا کتاب کی صورت میں جمع کیا تھا اور بلاشبہ یہ آپؓ کا امت پر بہت بڑا احسان ہے۔

اکتیسویں خصوصیت : آپؓ کو اللہ تعالیٰ نے RROPHETIC VISION فراستِ مومنانہ یا پیغمبرانہ عطا فرمائی تھی اور اس فراست سے متعلق حضورِ انورؐ کا یہ ارشاد بھی مدِنظر رہے کہ اتقوا فراسۃ المومن فھو ینظر بنور اللہ۔ یعنی فاروقِ اعظمؓ کا قلب مزکیٰ، نورِ ایزدی سے مستنیر تھا۔ جب جلولاؔ اور حلوان کی فتح کے بعد وہاں سے مالِ غنیمت مدینے پہنچا تو لوگوں کی آنکھیں جواہرات و نوادرات کو دیکھ کر خیرہ ہو گئیں اور خوشی کے مارے چہرے سُرخ ہو گئے مگر فاروق اعظمؓ پر گریہ طاری ہو گیا۔ صحابہؓ نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو فرمایا: "جب کسی قوم میں دولت کا سیلاب آتا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ عیش و عشرت ہوتا ہے اور اس کا منطقی نتیجہ خود غرضی اور استیثار ہوتا ہے (نہ کہ ایثار) اور اس کا منطقی نتیجہ تشتت اور افتراق۔ آپ کی یہ پیش بینی

بالکل صحیح ثابت ہوئی۔صرف بیس بائیس سال کے بعد حضرت علی کا عہد حکومت از ابتدا تا انتہا خانہ جنگی کی نذر ہوگیا اور پانچ سال کی مدت حکومت میں حضرت علیؓ نے نہ کوئی شہر فتح کیا نہ کسی کافر کو مسلمان بنایا بلکہ اس مدتِ پنج سالہ میں ۔۔یعنی ان کے عہدِ حکومت میں صرف اسی ہزار مسلمان، مسلمانوں ہی کی تیغ آبدار سے قتل ہوگئے اور اس خونی ڈرامے کا انجام یہ ہوا کہ اُن ہی کے ایک عاشق سابق نے انہیں قتل کر دیا۔

اکتیسویں خصوصیت : آپ نے بیت المال کو تمام مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت بنا دیا۔خلیفہ بیت المال کا مالک نہیں تھا بلکہ امین تھا۔ یہ طرزِ حکومت میں وہ انقلاب تھا جس کی نظیر کہیں موجود نہیں تھی۔ بقول اقبال اسلامی قانون کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

بتیسویں خصوصیت : اسلامی تقویم (کیلنڈر) کا اجراء فرمایا۔نیز مذہبی، فوجی، عمرانی، سیاسی، عدالتی اور عائلی شعبوں میں مفید اصلاحات نافذ کیں جن کی تفصیل بخوفِ طوالت درج نہیں کروں گا۔شائقین آپؓ کے سوانح حیات کا مطالعہ کرلیں۔ من شاء فلیراجع۔

خلاصۂ کلام اینکہ

حضرت فاروق اعظمؓ مجموعۂ کمالاتِ ممکنۂ انسانی تھے۔

جو شخص خالی الذہن ہوکر اور بغض و عناد سے پاک ہوکر ان کی پاکیزہ سیرت کا مطالعہ کرے گا تو اُسے صاف نظر آجائے گا کہ وہ بیک وقت اور بیک شخصیت، سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی۔حضرت مسیحؑ بھی تھے اور حضرت لقمانؑ بھی، سیزر بھی تھے اور نوشیرواں بھی امام ابوحنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادہمؒ بھی۔حمورابی بھی تھے اور چندر گپت موریا بھی۔بسمارک بھی تھے اور ڈیوک آف ویلنگٹن بھی۔روسو بھی تھے اور مزینی بھی۔ٹالسٹائی بھی تھے اور افغانی بھی۔۔ دنیا میں جس قدر حکمران گزرے ہیں۔ہر ایک کی حکومت کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا۔اگر وہ باقی نہ رہا تو دفعتاً فتوحات رُک گئیں اور نظامِ حکومت درہم برہم ہوگیا۔۔

سکندر ہر معاملے میں ارسطو کی ہدایات کا سہارا لیتا تھا۔ اکبر کے پردے میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے۔ ہارون کی عظمت برامکہ کے دم سے قائم تھی۔ چندر گپت، چانکیہ اور کاٹلیہ کا محتاج تھا۔ اشوک اپنے وزیر کا محتاج تھا، لیکن حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو اور اپنی عقل خداداد پر بھروسا تھا۔ وہ کسی مشیر کے محتاج نہیں تھے۔ حضرت خالدؓ جانباز کی فتوحات کو دیکھ کر عوام کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کامیابی کی کنجی صرف "اللہ کی تلوار" کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جب اس غلط خیال کے ازالے کے لیے حضرت خالد کو معزول کر دیا تو لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ فتوحات کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ سیاست ملکی اور انتظام کی خاطر بعض عادل بادشاہوں سے بھی مظالم سرزد ہوئے ہیں۔ مثلاً اشوک اور نوشیرواں کا دامن بھی ظلم و ستم اور خونریزی سے پاک نہیں ہے مگر فاروق اعظمؓ کی پوری لائف پڑھ جاؤ، ظلم و ستم یا عیاری (ڈپلومیسی/مکاری) اور غداری کا ایک واقعہ بھی نہیں ملے گا۔

اُنھوں نے اپنے اقوال اور اعمال اور کردار سے مسلمانوں میں تقویٰ کا وہ رنگ پیدا کر دیا تھا کہ جب مسلمانوں نے حمص فتح کیا تو عیسائی اور یہودی عورتیں (جو اپنے حسن و جمال کے لیے سارے عرب میں مشہور تھیں) مسلمان فوجیوں کو دیکھنے کے لیے اپنے اپنے بالاخانوں میں آن بیٹھیں۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے جب یہ دیکھا تو اُنھوں نے فوج کو حکم دیا کہ کوئی سپاہی نظر اُوپر نہ اُٹھائے۔ جب عیسائی عورتوں نے یہ سین دیکھا تو زلیخا کی سہیلیوں کی طرح بے اختیار پکار اُٹھیں "یہ انسان نہیں ہیں فرشتے ہیں جو خدا کے حکم سے زمین پر آ گئے ہیں"۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ اگر ہماری فوج کے افسرانِ اعلیٰ، اسلامی طرز زندگی اختیار کر لیں تو ہماری فوج کے جوان بھی فرشتے بن سکتے ہیں۔

بہرکیف، آمدم برسر مطلب۔ دنیا کے مشہور سلاطین جن ملکوں میں پیدا ہوئے وہاں مدتوں سے حکومت کے قوانین نافذ تھے۔ اس لیے اُن سلاطین کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی اور نہ کوئی بنیاد قائم کرنی پڑتی تھی۔ بخلافِ ایں، حضرت عمرؓ جس ملک اور جس قوم میں پیدا ہوئے وہ تو ان چیزوں کے نام سے بھی ناآشنا تھی۔ عربوں کی فطرت میں سرکشی، خودسری اور بغاوت کا مادہ موجود تھا۔ وہ کسی کی اطاعت کرنے کے عادی ہی نہیں تھے۔ اس قوم کا ہر نوجوان تَنَابَطَ شَرًّا

تھا، لیکن فاروق اعظمؓ نے ان میں اطاعتِ قانون کا وہ شعور پیدا کر دیا کہ لڑکیوں کے قافلے ان کے محافظ بن گئے اور زنا اور شراب پر فخر کرنے والے زاہد شب زندہ دار بن گئے اور ڈاکو مجاہد بن گئے تم ساری دُنیا کی تاریخ پڑھ جاؤ، کوئی ایسا حکمران دکھا سکتے ہو جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں بلا مبالغہ بعض اوقات دس، دس پیوند لگے ہوں۔ کاندھے پر مشک رکھ کر غریب اور بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھر آتا ہو۔ جب نیند کا غلبہ ہو تو فرشِ خاک پر سو جائے۔ بازاروں میں تنِ تنہا ایک دُرّہ ہاتھ میں لیے پھرتا ہو۔ بیت المال کے خارش زدہ اونٹوں کے بدن پر خود تیل ملتا ہو۔ اس کے دروازے پر نہ حاجب ہو نہ دربان، اِس کے باوجود اس کے رُعب کا یہ عالم ہو کہ قیصر اور کسریٰ اس کے نام سے خوفزدہ ہو جاتے ہوں اور عرب اور عجم دونوں اس کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتے ہوں اور وہ مردِ درویش جس طرف رُخ کرتا ہو، زمین دہل جاتی ہو۔ سکندر اور تیمور، چنگیز اور ہلاکو ہزاروں مسلح جوان ساتھ لے کر نکلتے تھے تاکہ رعب قائم ہو۔ فاروق اعظمؓ نے شام کے سفر میں سواری کے ایک اُونٹ اور خادم کے سوا کچھ نہیں لیا مگر چاروں طرف غل مچ گیا کہ مرکزِ عالم جنبش میں آگیا ہے۔

اس کے بعد اُن کی علمی حیثیت پر نظر ڈالو۔ صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے خالص اسی کام کو لیا تھا اور رات دن اسی شغل میں بسر کیے۔ مثلاً عبداللہ ابنِ عباس، زید ابنِ ثابت، ابوہریرہ، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن مسعود اور ابی ابن کعب اور معاذ ابن جبلؓ، ان کے مسائل اور اجتہادات سے موازنہ کر لو۔ تمہیں صاف مجتہد اور مقلد کا فرق نظر آجائے گا۔ زمانۂ مابعد میں اسلامی علوم نے بے انتہا ترقی کی، بڑے بڑے مجتہدین اور ائمہ فن پیدا ہوئے۔ مثلاً ابوحنیفہ اور شافعی، بخاری اور مسلم، رازی اور غزالی، اشعری اور باقلانی، ابوالحسن اشعری اور منصور ماتریدی وغیرہم لیکن انصاف سے دیکھو۔ حضرت عمرؓ نے جس باب میں جو ارشاد فرمایا، کوئی امام یا مجتہد اس پر کوئی اضافہ کر سکا؟ مسئلہ قضاؤ قدر، تعظیم شعائر اللہ، حیثیتِ نبوت و رسالت، احکامِ شریعت کا عقلی و نقلی ہونا، احادیث کے مدارجِ اعتبار، خبرِ احاد کی قابلیتِ احتجاج، احکامِ خمس و فئیت۔ یہ مسائل شروع سے آج تک معرکۂ آراء رہے ہیں اور آئمہ فن نے ان کے متعلق ذہانت، طباعی اور دقیقہ سنجی کا کوئی پہلو بھی اُٹھا نہیں رکھا ہے، لیکن انصاف کی نظر سے دیکھو

حضرت عمرؓ نے ان مسائل کو جس طرح حل کیا تھا، مجتہدین کی تحقیق کا ایک قدم بھی اُس سے آگے بڑھ سکا ہے؟ تمام ائمۂ فن نے ان کی پیروی کی اور جنہوں نے اُن سے اختلاف کیا، اُنہوں نے غلطی کی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اخلاقِ حسنہ کے لحاظ سے دیکھو تو انبیاء کے سوا یا تمام صحابہ کرام میں حضرت صدیق اکبرؓ کے سوا اور کون شخص ان کا ہم پایہ مل سکتا ہے؟ زہد و ورع، خشیۃ اللہ، ترکِ لذات، دُنیا سے بے رغبتی، شدید احساسِ فرض، آخرت میں جوابدہی کا خوف، عدل و انصاف کا بلند ترین تصور (جس کی نظیر نہیں مل سکتی) خدمتِ اسلام اور بہبودِ مسلمین، قناعت و خاکساری، تواضع اور انکساری، راستی، راستبازی، راست گفتاری، حق جوئی، حق پسندی، تقویٰ و طہارت، خدمتِ خلق، تبلیغ اسلام، صبر و رضا، فقر و مسکنت، تسلیم و توکل اور دوامِ حضور۔ یہ سب اوصاف ان کی ذاتِ ملکی صفات میں جس کمال کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ کیا افلاطون، مارکس آریلیئس، سنیکا، اہل رواق، اہل صومعہ، عرفا، ابراہیم ادھم، جنید، شبلی، رومی، عطار، سنائی، نجم الدین کبریٰ، فلاطینوس، فرفریوس، جمبلیقوس، گوتم بدھ، مہاویر، کنفوشس، زرتشت، شنکر، رام مُنج، ولبھ، مدھوا، آگسٹن، کلیمنٹ، آریجن، سینٹ فرانسس، دلکف، لوتھر، نانک، چیتن، رام چندر، کرشن وغیرہم میں اس سے بڑھ کر پائے جاتے تھے؟ کیا دُنیا میں کوئی بادشاہ یا فرمانروا ایسا گزرا ہے جس کی سلطنت کا رقبہ ۲۲ لاکھ مربع میل ہو اور اس کے کرتے پر کئی کئی پیوند لگے ہوئے ہوں۔ کیا قحط کے زمانے میں کسی بادشاہ نے وہی اناج کھایا جو رعایا نے کھایا؟ کیا کسی بادشاہ نے کسی بیوہ کے گھر جاکر پانی بھرا؟ یا کسی غریب عورت کا چولھا پھونکا؟ بیت المال کے بیمار اُونٹ کے جسم پر تیل ملا؟

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اب میں حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ کے الفاظ نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جن میں انہوں نے حضرت عمرؓ کی شانِ جامعیت کو نہایت دل کش انداز میں بیان کیا ہے:

سینۂ فاروق اعظمؓ را بمنزلہ خانۂ تصور کن کہ در ہائے مختلف دارد۔ در ہر دیہ صاحب

کمالے نشستہ - در یک در مثلاً سکندر ذوالقرنین باآںہمہ سلیقۂ ملک گیری وجہاں ستانی و جمع جیوش و برہم زدنِ اعدا ، در دیگر نوشیروانے بآں ہمہ رفق و رعیت پروری و دادگستری (ہر چند کہ ذکر نوشیرواں در مبحثِ فضائلِ فاروقی ، سوء ادب است) و در در دیگر امام ابوحنیفہ و امام مالک ، بآں ہمہ قیام بعلم فتویٰ و احکام ، و در درِ دیگر مرشدے مثل سیدی عبدالقادر جیلانی یا خواجہ بہاؤالدین نقشبند و در دیگر محدثے بروزن ابوہریرہ و ابن عمر و ابن مسعود ، و در درِ دیگر حکیمے مانند رومی یا سنائی یا عطار ـــ و مرداں گرداگردِ ایں خانہ ایستادہ اند و ہر محتاجے حاجت خود را از صاحبِ فن درخواست می نماید و کامیاب می گردد "

ABU BAKR WAS THE CONSCIENCE OF MOHAMMAD

OMAR WAS THE WILL OF MOHAMMAD

وآخرُ دعوٰنا اَنِ الحمدُ لِلّٰہِ ربّ العالمین الی یوم الدین ـ

بقیۂ عمرانیاتِ تاریخ از صا۱۰۴

طرف اس کا اعادہ بتکرار تمام کرتا ہے کہ انسان اپنے طور پر اپنی رہبری اور عالم انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کا اخلاقی ضابطہ تیار کرنے کا اہل نہیں - یہ وہ اہم متضمنات ہیں جن کی توضیح ، تحلیل اور تشریحِ قطعی کے لئے قرآن نے سورۂ نحل کے نویں رکوع کو مختص کر دیا ہے - یہ بیان کچھ اس قدر اہم ہے کہ آگے دوسرے دو رکوع بھی اسی بحث کی تنقیح میں صرف ہو گئے ہیں -

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً رَّجُلَیْنِ اَحَدُھُمَآ اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّھُوَ کَلٌّ عَلٰی مَوْلٰـہُ اَیْنَمَا یُوَجِّھْہُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ھَلْ یَسْتَوِیْ ھُوَ وَمَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَھُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (نحل ۷۶)

اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی ایک ہی صورت ہے :

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ۝

(سورۂ نصر)

عمرانیاتِ تاریخ (سوشیالوجی آف ہسٹری)

ڈاکٹر محمد بشارت علی

(یہ مقالہ پانچویں سالانہ قرآن کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا)

تاریخ کی تدوین اور اس کو سائنٹیفک اساس پر ڈھالنے کی کوششوں کا آغاز یوں تو چوتھی صدی قبل مسیح سے ہو چکا تھا، لیکن واقعہ اور حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ مسلمانوں سے قبل تاریخ کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس اعتبار سے تاریخ اور منہاجِ تحقیقِ تاریخ دونوں بلاشبہ فن کا درجہ تو حاصل کر چکے تھے، لیکن ان دونوں کے سائنٹیفک بننے کے لئے کئی صدیاں گذر گئیں۔ ہم نے سائنٹیفک کا لفظ دو معنی میں استعمال کیا ہے ایک تو عام اور متداول دوسرے اس کا مفہوم عمرانیات اور علوم عمرانی کے امتزاج اور معاونت سے تاریخ نے جو مقام اور درجہ حاصل کیا ہے، اُس کی وضاحت تاریخ کا اوّل الذکر مفہوم دورِ جدید کا بھی غالب رجحان ہے لیکن عمرانیاتی اور علوم عمرانی کا مفہوم اور ان دو کی اساس پر احوال اور واقعاتِ تاریخ کا جانچنا مسلمانوں کا خصوصی وظیفہ رہا ہے۔ اس اعتبار سے علوم کی دنیا میں ایک نیا اضافہ ہے۔ جس کو بدقسمتی سے خود مسلمان بھلا چکے ہیں۔ دورِ جدید میں تاریخ نگاری کا سائنٹیفک معیار درجۂ کمال پر پہنچ گیا ہے، لیکن عمرانیات کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا جائزہ اور واقعات تاریخ کی تحقیق۔ اور تنقید اور پھر نتائج کے مستنبط کرنے کا عمل شرمندۂ معنی نہ ہو سکا۔

عمرانیات اور علوم عمرانی کے نقطۂ نظر سے تاریخی واقعات کا محاکمہ اور تنقیح و تصدیق کا کام جس کو مسلمانوں نے شروع کیا تھا، کچھ بدلے ہوئے انداز میں جرمنی میں شروع ہوا۔ اوائل بیسویں صدی میں بعض جرمن مؤرخ اس زاویۂ نگاہ سے تاریخ کی تدوین پر متوجہ ہوئے تھے۔ لیکن جنگ عالمگیر اوّل کی وجہ سے یہ کام معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ جمود کی یہ کیفیت ہٹلری دور کے آغاز تک جاری رہی۔ ۱۹۳۴ء سے پھر اس کام کا آغاز پورے جوش اور انہماک سے شروع ہوا۔ ابھی یہ کام کچھ آگے ہی بڑھا تھا کہ پھر دوسری جنگِ عالمگیر کی وجہ سے اس میں جمود و خمود پیدا ہو گیا۔

اس مفید کام کے جاری رہنے میں دوسری رکاوٹ امریکانیت کا استیلا ہے۔ والٹر گولڈشی مڈ (WALTER GOLD SCHMIDT) نے بالکل صحیح کہا ہے کہ تاریخ سے متعلق امریکنوں کے زاویۂ نگاہ میں بڑا تضاد ہے۔ بلاشبہ تاریخ کے جائزہ لینے میں ان کا نقطۂ نظر سائنٹیفک ضرور ہے، لیکن تاریخ سے متعلق تمام نظریوں کے متعلق ان کا مرکزی تصور یہی ہے کہ واقعات و حادثاتِ تاریخ میں قوانین و ضوابط کا تلاش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ وہ لوگ جو تاریخی واقعات اور سرگزشتوں کو ارتقاء کے نقطۂ نظر سے جانچتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی امریکی علماء بڑی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ نظریاتی توجیہات کا مدّعا ان علماء کے نزدیک سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ واقعاتِ تاریخ کی صحیح تعبیر و تشریح کی جائے۔ زیادہ سے زیادہ تاریخ سے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ موجود الوقت لوگوں کے احوال ذاتی، عوائد و کردار کا جائزہ اس زاویۂ نگاہ سے لیا جائے کہ یہ ماحصل اور خلاصہ ہیں تسلسلِ روایات کا جو ماضی سے چلی آرہی ہیں۔ متذکرہ اُمور کی صحت اور جانچ کے لئے اشہاد و شواہد کی ضرورت بلاشبہ لاحق ہے تو مقامِ حیرت ہے کہ امریکی علماء بغیر ان شواہد و اشہاد کے دیکھے وہ استنتاجات اور فیصلے کر جاتے ہیں، جن کی صحت کو تسلیم کرنے میں یقیناً عقل ایک روک محسوس کرتی ہے۔ کیفیات اور انسانیات[1] بلاشبہ مفید علوم ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ علومِ عمرانی کے مسائل تحقیق کے آگے بڑھانے میں اُن سے بہت بڑی مدد ملتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ براہ راست تاریخی واقعات و حادثات کے مطالعہ اور ان پر تدبّر و تفکّر کی بجائے کیفیات اور انسانیات کو تاریخ کی تدوین کے لئے قرار واقعی سمجھ لیا جائے۔ کیفیات و انسانیات براہ راست تاریخ عمرانیات یا تاریخ کا بدل قرار نہیں دئے جا سکتے۔ البتہ محض قیاساً تاریخ میں ان سے بطور مواد و معطیات (DATA) مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ بات صاف طور پر کاشانۂ دل میں محفوظ رہنی چاہیئے کہ اخذِ مواد کی بنا پر قطعاً یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تاریخ کی انفرادیت اور مافوق الطبیعی مزاج کو ان کے یا دوسرے علوم عمرانی کے ماتحت کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے واقعات، حادثات اور احوال کو بلاشبہ تجرباتی نقطۂ نظر سے جانچا جا سکتا ہے۔ اور حالیہ واقعات و احوال سے ان کا تقابل و توازن تو ضرور کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سارے عمل میں تاریخ کی انفرادیت، باطنیت، روحانیت اور مافوق الطبیعی گہرائی کے ساتھ زمانی و مکانی علتوں

---

[1] کیفیات (ANTHROPOLOGY) انسانیات (ETHNOLOGY)

اور تصوّراتی واجبات سے اس کی علاقہ بندی کو بہرحال نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ان تمام اُمُور کو تاریخی حوالیت یا ہسٹاریکل فنامی نالوجی (HISTORICAL — PHENOMENOLOGY) کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ ادوارِ سابقہ میں جس طرح تاریخی واقعات کے تجزیہ و تحلیل، تشریح اور استنتاجات میں عمرانیت کو نظر انداز کیا گیا۔ اسی طرح تاریخ کی علّتِ اُولیٰ یعنی حوالیت جس پہ تاریخی زمان و مکان کا انحصار ہے اور ان سب میں جو تطبیق اور تحلیل کے قوانین کام کر رہے ہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ فلسفۂ تاریخ سے بعض مسائل جن کا تعلّق کیا، کیوں، کیسے، کب اور کس لئے وغیرہم سوالات سے ہے، حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن دورِ جدید کے فلسفۂ تاریخ نے اس چیز کو بھلا دیا کہ ان تمام سوالات کے ظاہر و باطن میں علّت و معلول اور حوالی کے جو متضمنات کام کر رہے ہیں، اُن کا بھی جب تک استقصا نہ کیا جائے گا، اس وقت تک نہ تو تاریخ کے متعلّق قیاسات، بدیہات، معقولات اور نہ پھر صحیح استنتاجات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

بلاشبہ تاریخ سے وسیع تر اور ہمہ گیر فوائد حاصل کرنے کے لئے تاریخی شغف اور دلچسپیوں میں ایک گونہ توازن تجرباتی منہاج کے امتزاج سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سارے عمل میں غلو کی بجائے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کی جائے۔ اس اطماح کے مدّ نظر طلبائے تاریخ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تاریخی آثار، شواہد اور اسناد کا براہِ راست مطالعہ کریں۔ یہ وہ اہم طریقہ ہے جس کو اپنانے کی سب سے پہلے قرآن شریف نے تعلیم دی ہے : قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ (۱۱ : ۶) تاریخ گویا کسی قوم کی معاشرت اور کلچر کی سرگزشت ہے۔ اس لئے بطور اجتماعی ورثہ تاریخ کی صداقت کا معیار یہی ہے کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے۔ زمان و مکان کا تسلسل بلا انقطاع باقی رہے۔ ماضی، حال میں اور حال مستقبل میں منتقل ہوتا رہے۔ اس لئے واقعاتی اور تجرباتی انداز میں کسی قوم کے تاریخی ورثہ کے صحیح متضمنات کا تعیّن اسی انداز پہ ہو سکتا ہے کہ انہیں موجود الوقت احوال پہ منطبق کیا جائے اور پھر رفتارِ حُسن و قبح کا اندازہ لگایا جائے۔ جن کو ہم تاریخ کے مختلف ادوار کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہر دَور کو ایک اگانہ نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اصلاً یہ ادوار کسی قوم کے کلچر کے ارتقا، تغیرات اضافہ جات کے مختلف مراحل اور منازل ہیں۔ یہ مراحل خطِ مستقیم کی طرح نہیں

چھتے۔ ان میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ مراحل ترقی کو اگر کیفیت اور ردّ وبدل کے اعتبار سے ناپا جائے تو ہر تاریخی دَور کو ۵ ، ۱۰ ، ۱۵ ، ۲۰ ، ۲۵ ، ۳۰ ، ۳۵ ، ۴۰ ، ۴۵ ، ۵۰ ، ۵۵ ، ۶۰ ، ۶۵ ، ۷۰ ، ۷۵ ، ۸۰ ، ۸۵ ، ۹۰ ، ۹۵ اور ۱۰۰ کے خطوط اور مدارج میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان مراحل سے گزر کر جب دَور سو سال کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر ایک نئی صدی اور ایک نئی روح کا آغاز ہوتا ہے۔ منجملہ اور مفاہیم کے، سورۃ العصر کا ایک مفہوم وہ ہے جس کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے۔ عصر کے معنی اگر سو سال کے لئے جائیں تو پھر ہم نے اُن کی تقسیم باعتبار تبدیلی بصورت تنزّل یا ترقی ہر پانچ سال میں کرتے ہوئے پورے دَور کو سو سال کے منتہا پہ پہنچایا ہے۔ یہ منتہا متقدّم روح زمانہ کی تبدیلی اور نئے روح کے آغاز کا موجب بن جاتی ہے۔ روحِ عصری کی یہ تبدیلیاں نظامِ معنی، معتقدات، تصوّرِ کائنات، ثقافتی، معاشرتی اور دینی نظام و موثرات و مقومات اور نظامِ اقدار پہ مرضیہ اور حیات خیز، یا نامرضیہ اور ہلاکت خیز انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر زمانے کے ردّ وبدل کے باوجود تمام منازل مصروحہ سے معاشرہ، ثقافت اور اشخاص نظامِ معنی کی اساس پہ ڈھلتے چلے جائیں تو پھر منازل تبدیلی کا ہر پانچسالہ نشان رکاوٹ کی بجائے استحالہ قوّت، بقائے قوّت، تحییت و ترقی کا موجب بن جاتا ہے۔

جی ایلیٹ اسمتھ (G. ELIOT SMITH) یا ڈبلیو آئی پیری (W. I. PERRY) کا نظریۂ تاریخ قرآن کے نظریہ کی رُو سے ساقط الاعتبار اور بے معنی نظریہ ہے اس لئے اس کا ذکر بے معنی ہے خود یورپ میں اس کی بے حد مخالفت کی جا رہی ہے۔ البتہ جرمنی کے تاریخی نظریہ کا ذکر اجمالی طور پر یہاں ضروری ہے کیونکہ بعض نکات میں یہ نظریہ گویا قرآن کے نظریہ کا ترجمان ہے۔ نوعِ انسانی کی تاریخ بحیثیتِ مجموعی تسلسلِ ارتقا کا نتیجہ نہیں، بلکہ تاریخ کی وہ کامیاب ترقی ہے جس میں فرداً فرداً مختلف مکان و زمان میں مختلف کلچر ایک جداگانہ واحدے یا دائرے کے طور پر تسلسل کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔ کلچر کے یہ دائرے دَورِ جدید کی اصطلاحی زبان میں کلٹور کرائز (KULTURKREIS) کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ دائرے ایک خاص مقام پر اُبھر کر زمین کے بہت بڑے حصّے کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اس طرح وہ ایک خاص نہج میں تعمیری اور معنوی وحدت اور عمل تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں۔ قرآن کے زاویۂ نگاہ سے بحیثیت مجموعی نوعِ انسانی کی تاریخ یقیناً

کا نتیجہ ہے۔ لیکن سورہائے انبیاء، قصص اور شعراء کی رُو سے تاریخی ترقی کا ایک خاص دھارا معنویت اور خدارسی کی طرف بہا ہے۔ ایک مخصوص زمان و مکان کے محدود دائرے میں یہ دھارا بہا اور پھر اپنی قدر معنویت کے استحکام و مضبوطی کے سوا صداقت و حقانیت کی بناء پر کرّہ ارضی کے بہت بڑے خطّات کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ انہیں کی مخالفت میں ایک دوسرا متوازی، ثقافتی دھارا ان لوگوں کی معاونت اور ساز گاری سے اُبھرا، اور قدر معنویت کے علمبردار یعنی انبیاء اور مرسلین کے مخالف اور اُن کو اور ان کی طرح دادہ ثقافت کے مٹانے کے درپے تھے۔ ثقافت کا یہ انداز دنیا کی تاریخ اور ادیانِ عالم کے صحائف میں کہیں بھی سوائے قرآن کے ظاہر نہیں کیا گیا۔ باعتبار ثقافت مخالفینِ انبیاء اور انبیاء دونوں کی طرح دادہ ثقافتیں، ثقافت کہلائی جا سکتی ہے۔ ایک کی وجودی علّت قدر معنویت، اور قدر معنویت کی اصل الاساس یعنی توحید قرار پاتی ہے اور دوسری ثقافت سراسر معنویت سے خالی ہے۔ ثانی الذکر کا انحصار کثرت معنی کے سوا مادّی اقدار بالخصوص زن، زر زمین اور نفیٔ حیات بعد الممات پر ہے۔ دونوں بھی متوازی انداز میں ترقی کرتے ہوئے زمین کے بہت بڑے حصّے کو گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ لیکن مماثلت رفتار فریب نظر کا موجب نہ ہونا چاہیئے۔ اِن دو کے درمیان ایک اور کلچر کے وجود اور رفتارِ ترقی کی طرف قرآن بار بار اشارہ کرتا ہے۔ ایک خاص زمانے اور خاص مقام پر انبیاء اور مشرکین کے کلچر کے نکتہ انجماد کے طور پر منافقین کا ایک اور کلچر اُبھرتا ہے۔ لیکن یہ کلچر چونکہ اثباتِ معنیٰ یا نفیٔ معنیٰ پر منحصر ہونے کی بجائے معلّق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ابھار صرف ایک خاص مقام اور خاص دَور کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ دونوں ثقافتوں کے لوگ اس کلچر کے لوگوں کو مردود اور مطرود قرار دیتے ہیں۔ سورۃ انعام میں حضرت ابراہیمؑ کا قصّہ اصل میں سورۂ بقرہ میں آدمؑ کے تسخیر کائنات کے قصّے کا ایک تسلسل اور مزید تحلیلی اور استقرائی تشریح ہے۔ انسان کو قرآن کائنات کا ایک اہم حصّہ قرار دیتے ہوئے اس بات کا منطقی اور تحلیلی انداز میں مطالبہ کرتا ہے کہ سائنٹیفک علم کائنات کا مطالعہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اگر اسی کے ساتھ انسان کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ دونوں میں جو ارتباط کلی، معنوی اور وجودی تعلّق ہے، اس کا اظہار غالباً سورہائے بقرہ اور انعام میں نوع انسانی کی تاریخی سرگزشت میں سب سے پہلے ہوا ہے۔ مومنین، مشرکین اور منافقین کے احوال کی تشریح جس ترتیب اور معنوی ارتباط

اور محبتِ قطعی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اُن کے منجملہ متضمنات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ نوعیت اور حیاتیاتی عوامل کے اعتبار سے بلاشبہ سب انسان ایک ہیں لیکن جہاں تک حیاتیاتی اور جسمانی کیفیات، ساخت اور تعمیر کا تعلّق ہے تمام نوعِ انسانی ایک نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ یہ عوامل نوعِ انسانی کی تاریخ ثقافت، عواد و کردار پر اثرانداز ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں کلچر کی علتِ اُولیٰ یا اس کی وجودی تم نہیں ہو سکتے۔ کلچر کے اختلافات کا تعلّق عضویاتی، جسمانی یا حیاتیاتی اختلافات کا نتیجہ نہیں۔ کلچر کی پیہم تبدیلیاں، نئے اجزاء کا شامل ہونا بیرونی کلچر کے تصادم اور آویزش اور پھر عمل اور ردِّ عمل کا سلسلۂ لامتناہی، ہر حال میں کلچر سے توافق اور تمسّک باہمی یہ اور دوسرے مؤثرات جو کلچر کی دنیا میں مدّ و جزر پیدا کرتے رہتے ہیں، اس بات کے شاہد و واحق ہیں کہ یہ نتیجہ نہیں عضویاتی یا حیاتیاتی اختلافات کا۔ ان کا تعلّق نظامِ معنی، نظامِ اخلاق معتقدات، مزاج عقلی اور ثقافتی ذہنیت سے ہے۔ سورۂ الم نشرح اور سورۂ رعد کی رُو سے یہ وہ عوامل ہیں جو قوموں اور کلچروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نظامِ نفسی اور مزاج کے اختلافات اصل میں اختلافات کی سرشت اور بنیاد ہیں۔ اس لئے ایک خاص کلچر کا پروردہ دوسرے اور کلچر میں جذب و فنا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ انشراح کُلّی نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا مزاج عقلی، ثقافتی ذہنیت اور تصوّرِ کائنات بدل جائیں۔ قلبِ ماہیّت کے ساتھ وہ دوسرے کلچر سے انسلاک اور تعلّقِ خاطر پیدا کر سکتا ہے۔ قلبِ ماہیّت کی اوّلین صورت یہ ہو گی کہ جس کلچر میں جذب ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کے نظامِ معنی، اقدار اور تصورِ کائنات کو قبول کر لیا گیا اور ایک نئی قسم کی انفرادیت باطنیّت، رُوحانیت، جمعیّت، جامعیّت، مافوق الطبعی گہرائی اور حُسنِ انتخاب کے خاص طرق کو جو کسی کلچر کی عوامل ترکیب ہیں اپنی شخصیّت اور نظامِ نفسی کا جزو ترکیبی اور اُس کی تہہ و سطح کا محرّک اوّلین مان لیا گیا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (سورہ رعد پورا رکوع خصوصیت کے ساتھ آیت ۱۲)

عمرانیاتِ تاریخ کے متذکرہ مسائل کو پہلی مرتبہ بڑی خوبی سے قرآن نے پیش کیا ہے۔ سورہ ہائے انبیاء، قصص، مشرکوں، منافقوں وغیرہ، گویا اس تاریخی قصّے کی منجملہ اور باتوں کے تشریح نہیں کہ اختلافات کی وجہ حیاتیاتی مؤثّرات نہ تھے۔

انبیاء علیہما السّلام نے جس ثقافت کو پیش کیا تھا وہ مخالفین کے لئے قابلِ قبول نہ تھے - اس لئے دعوی اور خاندانی ونسلی تعلّقات کے باوجود مخالفین نے نبی کی ثقافت کے حاملین کو نہایت بیدردی، سفّاکی اور درندگی سے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ قرآن کے تاریخی واقعات کے تجزیے کی ایک لمِ منجملہ اور باتوں کے اگر مزاج عقلی ثقافت اور ثقافتی ذہنیت بالخصوص اس کی وجودی علّتِ نظام معنی کو قرار دیا جائے تو ابراہیمؑ نمرود اور موسیٰؑ اور فرعون کی مخالفت کا وہ بیّن اور استمراری ثبوت ہے جس کی مثال دورِ جدید کے فلسفہ، تاریخ اور منہاج تاریخ نگاری میں نہیں ملتی۔ قرآن شریف کا میرے نزدیک زندہ معجزہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس نے پہلی مرتبہ انسان کو یہ سبق پڑھایا کہ اقوام اور اس کی ثقافتوں اور معاشرتی نظاموں کے اختلافات میں نوع انسانی کی مخاصمانہ اور معاندانہ اختلافات کی کنہ تلاش کرنا چاہیئے۔ غیر شعوری طور پہ تاریخی ادوار کی تقسیم میں معاشرتی اور ثقافتی اختلافات کو معاشرتی اور ثقافتی منہاج پر جانچنے، پرکھنے، واضح کرنے اور سمجھانے کی بجائے دوسرے ہی عوجاجی طریقوں کو اختیار کیا گیا۔ جن کا بہر حال تاریخ اور مزاجِ تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی سرگزشت آج کے دور میں بھی اٹوپیا (UTOPIA) یا محض آئیڈیلوجی (IDEO-LOGY) بن کر رہ گئی ہے۔ تاریخ کے سائنٹیفک اور با مقصد ہونے کا اقوامِ یورپ کو دعویٰ تو ضرور ہے لیکن آج بھی وہ قرآن کے تاریخی مطمحِ نظر اور حکمیاتی و عمرانی تحلیل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قرآن ہی کے مسلک پہ گامزن ہو کر مؤرّخینِ اسلام بالخصوص ابنِ خلدون کے سائنٹیفک اصول تاریخ کو منتہائے کمال پہ پہنچانا۔ مقدمہ تاریخ کا ہر باب، ہر موضوع، ہر مقولہ قرآن سے ماخوذ اور قرآنی نظریہ تاریخ کی منہ بولتی شرح ہے۔ ابنِ خلدون نے قرآن کے نظریہ عمرانیات تاریخ کے پیش کرنے میں ایک جگہ نادالسنتہ اور غیر شعوری طور پہ غلطی کی ہے۔ ماحول اور موسمیات کے اثرات کی تشریح میں قرآن اور متقدّمین کے زاویۂ نگاہ کی غلط ترجمانی کی ہے۔ ماحول اور موسم کی جبریت یا کلچر اور معاشرت کو خارجی قوّتوں کا پابند قرار دینا اجتہادی غلطی نہیں بلکہ صریحاً قرآن کی غلط تعبیر ہے۔ سورۂ نحل، یٰسین، رحمٰن اور ان گنت مقامات پہ قرآن بار بار اس کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان کائنات اور اپنے حوالی کا تابع فرمان نہیں۔ انفس و آفاق اس کے تابع فرمان ہیں۔ اس کی تخلیق کے مقتضیات داعیات وجود اسی طرح پورے ہو سکتے ہیں کہ انسان ان کو مسخّر کرے۔ تابع

فرمان لائے اور ان کی جلی و خفی قوتوں سے تعمیرِ شخصیت، تعمیرِ معاشرت اور ہر آن تعمیرِ ثقافت بالخصوص معرفتِ ذات اور معرفتِ ذاتِ بحت کے کام لے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ط وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ (لقمان ۲۰) [مزید ملاحظہ ہو سورۂ ابراہیم آیات ۳۲ تا ۳۴ سورۂ نحل آیات ۱۰ تا ۱۹]

عضویات کی طرح ماحول بھی معاشرتی اور ثقافتی احوال کے لئے ایک خارجی چیز ہے۔ بلاشبہ ہر کلچر اپنے خارجی احوال اور جغرافیائی موثرات سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن نوامیسِ فطری کا وہ غلبہ نہیں ہوتا جو نوامیسِ عقلی کا ہوتا ہے۔ سورۂ رعد کی اس حقیقت کو عمرانیات کے جغرافیائی مکتبِ خیال کے سرخیل بیوکل (BUEKLE) نے اپنی کتاب تاریخ تمدن میں تسلیم کیا ہے۔ ہر کلچر اپنے طبعی ماحول سے جس میں وہ بالقوہ یا عمل اور وجود نفوذ رکھتا ہے۔ اس حد تک ان سے متاثر ہوتا ہے کہ ہم یہ بخوبی سمجھ جائیں کہ جغرافیائی عوامل کس حد تک کلچر کی ہیئت و شکل کی تعمیر میں سو دسی موثرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کلچر میں ایک انفرادیت، باطنیت، روحانیت اور مافوق الطبعی گہرائی ہوتی ہے۔ اس لئے کلچر میں تکوین اور تخلیق سرشت اور اس کی کنہ میں داخل ہیں۔ یہ محرکات کلیتہً اس کو جغرافیائی موثرات، ماحول اور عضویات و حیاتیات کا پابند نہیں بنا سکتے۔ کلچر کی خلاقی اور تکوینی شان کا یہ عالم ہے کہ بعض موقعوں پر ان موثرات کو بھی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

کلچر کی وضاحت کے سلسلے میں ایک طرفہ تمام طریقے ناکام ہو جاتے ہیں۔ فرداً فرداً مذہبی، عضویاتی اور حوالی اساس پر کلچر کی توضیحات کا جو طریقہ آج رائج رہا ہے اس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کلچر ایک مجموعہ کل کا نام ہے۔ اس لئے تمام زاویہ ہائے نگاہ کے مجموعی اساس پر کلچر کی تحلیل، توضیح، نقد اور تنقیح کی جائے تو یقیناً ہم کلچر کی ہمہ ابعادی کیفیات، مزاج اور متضمنات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن شریف کے نظریۂ توحید کے منجملہ اور معنی کے، ایک معنی بلاشبہ یہ بھی ہیں کہ انسانی کلچر کی وحدت آسائی اور معنوی اتحاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کلچر کو خدا رسائی کا ذریعہ اور خدا کے واحد ہونے کے ذاعنیہ پر ایمان کلی لایا جائے:-

وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ج لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ (بقرہ

(۱) ——— کیا دورِ جدید میں تاریخ کے متذکرہ مضمرات کا لحاظ کرتے ہوئے کتابیں لکھی گئیں، یا لکھی جا رہی ہیں۔ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب مغرب کے معاملے میں اثبات میں بھی ہے اور نفی میں بھی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اضطراری طور پر دورِ عروج تک متذکرہ امور و مصالح کی روشنی میں کتابیں لکھی گئیں۔ انحطاط کے بعد جب کہ مسلمان خود اپنی تقدیر، مقومات، توارثات اجتماعی اور نظام معنی کو بھلا چکے۔ اس منہاج اور مسلک کی اساس پر تاریخ نگاری کے عمل کو جاری رکھنا ممکنات سے نہ تھا۔ یورپ میں بیسویں صدی کے آغاز تک اس خاص مسلک اور مطمحِ نظر سے تاریخ نگاری کا فن مفقود رہا۔ فلسفۂ تاریخ کے یورپی علمبردار بالخصوص ہیگل بھی باوجود اپنی مذہبیت اور عمیق و بسیط فلسفیانہ مزاج کے اس طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ اس بنا پر ہم نے اوپر کی سطور میں نفی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جہاں تک اثبات کا تعلق ہے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جرمن تاریخ نگار ارنسٹ ٹرائلش (TROELTSCH) نے ہسٹوری سی زم (HISTORICISM) کے عنوان سے ایک نئے شعبۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ بلاشبہ تاریخ کے تجزیہ و تحلیل میں مذہبی نقطۂ نظر سے کام لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک بیش قرار کارنامہ ہے، لیکن تاریخ کی مذہب کے نقطۂ نظر سے ترجمانی میں ایک جائے نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے تاریخ اور مذہب کی کلیت اور ہمہ گیری کو نظر انداز کر دیا گیا ہے زندگی کی تمامیت اور وحدت و کلیت پر یہ ضرب یقیناً تاریخ کو جو تمام زندگی پر حاوی ہے مجموعہ تقاصت و اضداد بناتی ہے۔ زندگی کی کلیت کا یہ خاتمہ عیسائی مذہبی ذہن کی ثنویت کا نتیجہ ہے جو آج بھی جسم اور روح، دین اور دنیا کو دو متضاد، متناقص اور باہم حریف اجزاء سمجھتا ہے۔ جسم و روح کی یہ دوئی ٹرائلش کی تحریر کے ہر بُنِ مُو سے ظاہر ہے۔ دوسرا عیب یہ ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے تاریخ کی ترجمانی میں صرف عیسائی مسلک کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ قرآن شریف کی ترجمانی میں جو وحدت، کلیت، ہمہ گیریت، آفاقیت، روحانیت اور انضمام کی کیفیت نظر آتی ہے وہ سرے سے یہاں مفقود ہے۔ مذہب معاشرہ کا ایک اہم مظہر ہے اس لئے مذہبی اطماح سے تاریخ کا جائزہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر دور کی تاریخ کی توضیح و تشریح میں معاشرتی، ثقافتی، روحانی، اور نفسی مضمرات اور عوامل کو دیکھا جائے اور اس اساس پر تاریخ کے منازلِ ارتقاء کو متعین کیا جائے۔ ٹرائلش کے ہاں جو قرآن

کے مسلک تاریخ کی غایت الغایات ہے، مفقود ہے۔ انہیں فروگذاشتوں کی بنا پر پروفیسر اسٹارک (STARK) نے اپنی کتاب سوشیالوجی آف نالج۔ (SOCIOLOGY OF KNOWLEDGE) میں سخت تنقید کی ہے۔

قرآنی عمرانیاتِ تاریخ کی رُو سے ارتقاء قانونِ قدرت اور زندگی کا ایک لازمی وظیفہ ہے لیکن ارتقاء کے یورپی تصوّر میں فنا فی النسل، لازمیت اور دورِ نظری کے جو مفہوم لئے جاتے ہیں وہ سراسر غلو اور امیدِ موہوم پر مبنی ہیں۔ ارتقاء کے معنی یہ بھی نہیں کہ اضطراراً واقعات اور حادثات کا ظہور ہو تاکہ خود بخود زندگی تحت سے فوق یا پست حالت سے اعلیٰ حالت پر پہنچ جائے۔ محض ماہرین علم الانسانیات نے اس امر پہ استدلال کیا ہے کہ وحشی اور غیر متمدّن قبائل کی زندگی اضطراراً پست حالت سے شروع ہو کر خود بخود اونچے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ ان کی معاشرت اور ادارے خود بخود ترقی یافتہ اور مہذّب اقوام کے اعلیٰ معیار کو پہنچ جاتے ہیں یہ استنباط حیاتیات کے اس مفروضہ پہ مبنی ہے کہ حیاتیات کا ارتقاء نہایت ہی پست اور ابتدائی درجہ سے شروع ہو کر زندگی کے اعلیٰ درجہ پہ پہنچ جاتا ہے۔ محض حکماء کا خیال ہے کہ ارتقاء داخلی حرکات کا نام ہے یعنی یہ کہ یہ ایک روحانی قوت ہے اور اس قوت کے نتیجہ اور حرکت کی بنا پہ تخمر مایہ (PROLOPLASM) کو بھی حرکت، ترقی اور وسعت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ قرآن نے ان تمام غلط تصوّرات کی تردید کی ہے۔ حیاتیاتی نظام کا ارتقاء از رُوئے قانون کسی معیّنہ قاعدے کا پابند ہے تو معاشرتی اور ثقافتی یا رُوحانی نظام کسی نہ کسی عین و منشا کے تابع ہیں۔ جس حد تک یہ نظام ان کی پیروی کرتے ہیں، ترقّی ہی ترقی ہوتی ہے اور جب ان سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے تو تباہی لازمی ہو جاتی ہے۔ سورۂ اعراف کے رکوع ۱۲ میں قرآن کا استدلال ہے کہ انبیاء اور مرسلین اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ نوعِ انسانی کو ہمہ جہتی اعتبار سے ترقّی ہو۔ اس قضیّہ کو دورِ جدید کی اصطلاح میں ادا کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرت اور ثقافت اپنی وجودی اور ارتقائی علت یعنی نظامِ معنی اور اقدار کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ بنا برآں معاشرہ اور ثقافت کے سوا رُوحانیت اور مذہبیت میں بھی ترقی بغیر اتباع نظامِ معنی اور نظامِ اشخاص جس کا اصطلاحی قرآنی نام نبوّت ہے، ممکن نہیں۔ قرآن کے اس قضیّہ کی من وعن توضیح تاریخی واقعات اور قوموں کا عروج و زوال ہے۔ (مزید ملاحظہ ہو سورۂ رعد

رکوع ۱۲) یہ مسائل معاشرتی اور ثقافتی نظاموں کے وجود و بقا کے لئے اس قدر اہم ہیں کہ قرآن نے انہیں اوّلین وسیلے پر سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۵ میں صراحتاً بیان کیا ہے۔ تاکہ حال و مستقبل کی نسلیں انہیں معیار و محک قرار دیتے ہوئے ماضی کی قوموں کے عروج و زوال کی علّتِ اُولیٰ کو سمجھ سکیں اور ان کی روشنی میں تاریخی واقعات کی رفتار و نتائج کو جانچیں اور پھر حال و مستقبل کے معاشروں اور موجودہ یا ابھرنے والی ثقافتوں کے لئے با مقصد اور با علیٰ مسلک متعین کریں۔

سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۵ سے صاف ظاہر ہے کہ ارتقاء نہ صرف زمانی اعتبار سے عمل تسلسل کے تابع ہے۔ بلکہ عمل تسلسل کا لازماً اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جبکہ معاشرت اور ثقافت کی وجودی اور ارتقائی علّت یعنی نظام معنی کا اعادہ بار بار ہوتا رہے۔ جس قضیہ کو سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۵ میں تجرباتی تصریح کے ساتھ بلیغ کیا گیا ہے۔ اسی سورۃ العصر میں تاکیداً یوں وضاحت کی گئی ہے کہ : إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

نوعِ انسانی کی تاریخ ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف رہی اور رہے گی۔ یہ صورتِ حال نتیجہ ہے ثقافتی رجحانات کی انفرادیت اور اختصاص کا۔ اگر کلچر کو جوہرِ نایاب، بے مثال اور بخت و اتفاق کا نتیجہ نہ قرار دیا جائے تو کلچر کے ناپیدا کنار سمندر سے جو تاریخی لہریں اور تلاطم اٹھیں گے وہ بھی انوکھے اور فقید المثال ہوں گے۔ تاریخ کے عام رنگ میں ان خصوصیات کی طرف عمرانیات تاریخ اگر مفکّر تاریخ کی توجّہ مبذول کراتی ہے تو اس کا مدّعا یہی ہے کہ تاریخ نگار ان احوال سے گزر نہ جائیں۔ بلکہ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔ یہ خصوصی احوال بلاشبہ مختلف قوموں کے فلسفۂ حیات اور تصوّرِ کائنات کے سمجھانے کا نہ صرف ایک ذریعہ ہیں بلکہ یہ وہ متضمنات ہیں جن سے عمل تسلسل، قانون ارتباط اور علّت و معلول کے رشتے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے مختلف تار و پود سے مختلف کلچر وجود میں آتے ہیں۔ اس لئے نہ تو مؤرّخ، عمرانیات اور ثقافتیات سے اور نہ عمرانئین و ماہرین ثقافت تاریخ سے فائدہ اٹھائے بغیر رہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ تار و پود کے ان رشتوں کے سوا وہ خصوصی امر جن سے کلچر قوام پذیر اور مرکب ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مؤرّخ ان خصوصی عناصر

میں سے ہر ایک اور پھر بحیثیتِ مجموعی ان کی تاریخ اور حقائق نفس الامری کا پتہ چلائے رسوم و رواج، تکنکی مہارت اور کمالات، امتیازی اوصاف غرضیکہ ہر عنصر کی جداگانہ تاریخ اور ان کے وجودی اور ارتقائی منازل کا اتا پتہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کلچر کوئی عملِ اضطرار، بخت و اتفاق اور لطف و تفنن کا نتیجہ نہیں۔ کلچر معاشرت کی سرزمین سے انسانی احتیاجات کی تکمیل کے لئے وجود میں آتا ہے۔

انسانیت کی طویل تاریخ میں قرآن کے سوا کوئی اور ایسی مستند و قابلِ متبع کتاب نہیں جس نے انسان اور انسانی حقائق کو تاریخ اور عمرانیات کے توالی ربط و تعلق سے جانچا ہو۔ تاریخ کی طرح عمرانیات کو بھی انسان سے کلیتہً سروکار ہے۔ دونوں کے مطالعہ کا موضوع انسانی اعمال ہیں۔ بنا برآں دونوں سے انسان کے متعلق دقتِ نظری سے معلومات اور تحقیق کے مواقع ملتے ہیں۔ کائناتِ فطرت خدائے عزّ و جل کی پیدا کردہ ہے، اس لئے انسان رموز و اسرار کائنات کا انکشاف نہیں کر سکتا۔ لیکن کلچر اس کی پیدا کردہ کائنات ہے اس لئے اپنی خلق کردہ کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کر سکتا ہے اور اس کے متعلق قابلِ توثوق علم و معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ تاریخ اگر معاشرت اور ثقافت میں امتزاج نہ پیدا کر سکے تو تاریخ اپنے وجود اور معنی کو ختم کر دے گی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ معاشرہ انسانی سعی پیہم اور تاریخی تسلسل کی پیداوار کا نام ہے۔ معاشرہ اور تاریخ نوامیس فطری کی غیر مرئی قوتوں کا نام نہیں نوامیس فطری بالقوہ تاریخ انسانی مساعی اور معاشرت کے واسطہ محرک اور باعمل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ اور علوم عمرانی کا یہ ربط باہمی اس لئے قائم ہے کہ نظریات اور عمل کے حامی دونوں مشترکہ طور پر کائناتِ فطرت کے نظم و ضبط کے سربستہ میکانیزم (MECHANISM) کو سمجھیں اور بقول کانٹ قانون توازن کو دریافت کریں۔ اسی خیال کو قرآن نے کانٹ سے کئی سو سال پہلے وزن و قسط کے وسیع و ہمہ گیر اصطلاحوں میں واضح طور پر بیان کر چکا ہے۔ کانٹ نے قانون توازن کا ذکر صرف فلسفہ اور سائنس کے سلسلے میں کیا ہے۔ لیکن قرآن کا یہ آفاقی اور ہمہ گیر قانون فلسفہ اور سائنس کے علاوہ معاشرت، ثقافت اور روحانیت کو بھی اپنی گرفت اور حیطۂ اقتدار میں لے لیا ہے: وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (رحمٰن ۷، ۸) ——— دورِ جدید میں عمرانیاتِ تاریخ کے متعلق اطالوی شہرۂ آفاق عمرانی ماہر پاریٹو (PARETO) نے جن افکار کا اظہار کیا ہے، اُن کی مقبولیت کے

پیشِ نظر جملہائے معترضہ ہی کے طور پر یہاں کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نے انسان کو کلیتہً نوامیس فطری کے تابع قرار دیتے ہوئے انسان کو بے بس اور لاچار کر دیا ہے۔ انسان نہ تو باختیارِ خود آزاد ہے اور نہ ہی تاریخ کی سمت کو موڑ سکتا ہے۔ وہ بخت و اتفاق کا زائیدہ اور شکار ہے، تاریخ جس طرف چاہے اُسے بہالے جا سکتی ہے۔ یہ خیال قرآن کے زاویۂ نگاہ سے قابلِ اعتنا نہیں، کیونکہ انسان ہر چیز کا تقدیر ساز، اور ہر چیز اُس کے حیطۂ اقتدار میں ہے۔ اسی موضوع کو قرآن بار بار دُہراتا ہے۔ منجملہ اور مضامین کے سورۂ نحل کا ایک موضوعِ بحث یہ بھی ہے۔ تاریخ کا کارنامہ اور عمل کوئی معجزہ نہیں کہ درون، بیرون بن جائے یا بیرون، درون۔ تاریخ کے ادوار میں اعادہ اور پرانے واقعات دُہرائے نہیں جاتے، بلکہ تاریخ کا ہر دور نقشِ کہن کو مٹا کر ایک نیا خاکہ پیش کرتا ہے تاکہ نئے دور کے اس خاکے کو متعلقہ دور کی نسل اپنی معاشرتی زندگی میں تجرباتی انداز میں آئے۔ بہرحال تاریخ گردشِ واقعات کا نام نہیں، بلکہ آگے کی طرف ایک حرکت ہے۔ یہ حرکت پیہم بھی ہے اور ہر حرکت ارتقائی منزل کی طرف ایک قدم ہے۔ چنانچہ سورۂ رحمٰن میں اس فکرِ آخریں اور زندگی بیز اور زندگی زا تصور کی یوں ترجمانی کی گئی ہے

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝ (۲۹)

ایک متوازن صورتِ حال سے دوسری متوازن صورتِ حال کی طرف بڑھنے کا عمل گویا اُچھل پھاند کا عمل نہیں۔ اس سارے عمل کی حیثیت بلاشبہ بہاؤ کی صورت ہے۔ یہ بہاؤ ہر وقت ایک نئی چیز کے معرضِ وجود میں لانے اور پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اسی صورتِ حال کا تجزیہ ناقد النظیر حیثیت میں قرآن شریف کی آیت ۳۳، جو سورۂ برأت سے متعلق ہے پیش کیا گیا ہے۔ اسلام بلاشبہ آخری دین ہے اور بقول قرآن دین بھی مکمل ہو گیا اور دنیا جہان کی ساری نعمتیں بھی مکمل کر دی گئیں (مائدہ ۳) اس کے معنی یہ نہیں کہ اسلام کے پھیلاؤ اور ہمہ گیری کا کام ختم ہو گیا۔ ہر دور میں اس کا نیا ظہور ضروری ہے۔ ہر دور کے خاتمہ اور نئے عہد کے ظہور سے جو نئے معنی، نیا تصورِ کائنات، نئے زمانی و مکانی افکار اور نئے معاشرتی و ثقافتی رُجحانات، غیر متوازن انداز میں پیدا ہوں گے۔ اِن میں توازن کی یہ صورت ہو گی کہ اسلام کو غالب کیا جائے۔ اِن رُجحانات کی متابعت میں نئے کلچر اور نئے معاشرتی و دینی نظاموں کے وجود میں آنے کے بدیہی امکانات موجود ہیں۔ یہ نظام دنیا میں تشتت اور پراگندگی کا موجب ہوں گے۔ ان سب

کے دبانے اور نورِ انسانی کے حالات و کیفیات، معاشرت اور ثقافت، معنویت اور رُوحانیت، دین اور ایمان میں توافق، توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی واحد صورت اسلام کا غلبہ ہے :

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۂ توبہ آیت ۳۳)

تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ متذکرہ آیت کا اعادہ سورۂ فتح (۲۸) اور سورۂ صف (۹) میں ہوا ہے۔ اِن تینوں آیتوں میں تین تہذیبوں کی طرف علی الترتیب اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک تو دین کی اساس پر طرح دادہ یہود و نصاریٰ کی تہذیب جو زندگی، دُنیا یا حسیّات کی نفی اور حیات بعد الممات یا دین کے اقرار پر منصّۂ شہود پر آئی ہے۔ بظاہر یہ تہذیب نفیِ حیات اور فنا فی الآخرت کی حامل ہے، لیکن شروع ہی سے یہ تہذیب تضاد، تناقصات اور داخلی کش مکش کا شکار رہی ہے۔ اپنے تصوّرِ کائنات اور فلسفۂ حیات کی متابعت میں اس تہذیب کے حاملین سازگاری اور توافق نہ پیدا کر سکے۔ اس لئے انہوں نے اپنے پیغامِ عمل، تصوّرِ کائنات، فلسفۂ حیات اور دین و کتاب کو بدل ڈالا۔ تحریف بقولِ قرآن (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ و آلِ عمران) اُن کی زندگی مقصودِ غائی بن گیا۔ زندگی کی نفی کرنے والے اپنے اس موقف پر قائم نہ رہ سکے۔ دین کو چھوڑ کر دُنیا کے اس قدر مفتون بن گئے کہ طلبِ جاہ زن، زر، زمین اور لذّت طلبی زندگی کی آخری قدر بن کر رہ گئیں۔ بہرحال یہ تضاد اور تحریف کا سلسلہ شروع سے اس تہذیب کا جُزوِ لاینفک اور خمیرِ اصلی بن کر رہ گیا۔ سورۂ مائدہ کی تفصیل کی رُو سے یہ پکّے دنیادار اور دولت اور انتفاعِ ناجائز یا استیصال اور استحصال کے دلدادہ بن کر رہ گئے ـــــ اجتماعِ نقیضین کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ اس لئے توافق کی صورت یہی ہے کہ وہ اِطماحی تہذیب جو دین اور دنیا کے امتزاج، توازن، اعتدال، توافق، انضمام تکمّل پر مبنی ہے اور جس کا نام اسلام ہے، اپنائیں : قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آلِ عمران ۶۴)

ظاہر ہے کہ علمی تہذیب کے مقابل اطماحی تہذیب کی انضمامی خصوصیات اس پر غالب ہونے کے متقاضی ہیں۔ قرآن کی پیشین گوئی کا مدّعا اور نئے ظہور اور

غلبے کے امکانات اُسی وقت پورے ہوں گے جبکہ اسلام اس پر غالب آئے۔ جب اسلام غالب آجائے گا تو نہ صرف اسلام کا نیا ظہور ہوگا، بلکہ ایک نئے دَور اور ایک نئی تہذیب کے ظہور کا دَور ہوگا۔ جس میں مشرق و مغرب بقول نارتھروپ (NORTHROPE) مل کر ایک ہو جائیں گے۔ مشرق و مغرب کے نئے ظہور کے معنی یہ ہیں کہ عیسائی اور یہودی یا دورِ جدید کی متناقض تہذیبیں اسلام میں فنا ہو کر ایک ہو جائیں گی۔ جب تک یہ امتزاج اور انضمام نہ ہوگا۔ اس وقت تک زندگی کے ناپیدا کنار اور اتھاہ سمندر سے جو ثقافتی لہریں اُٹھیں گی ان کا یہ عالم ہوگا کہ کبھی عینی لہریں اطماحی لہروں یا اہل کتاب کی تہذیب، اسلامی تہذیب کو دبا دیں گی اور کبھی اسلام اہل کتاب کی تہذیب کو دبا دے گا۔ یہ مدّ و جزر، غلبہ اور دباؤ کا یہ عملِ پیہم اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ بفحوائے آیت بالا اسلام اہل کتاب پر غالب نہ آجائے گا۔ دونوں تہذیبوں کا یہ تصادم اُتار چڑھاؤ، غلبہ اور دباؤ کا سلسلہ قرآن کی پیش گوئی کے اعتبار سے ایک ہزار سال تک چلتا رہے گا۔ اس مدّت کے خاتمے کے بعد اسلام، اسلامی کلچر اور اسلامی فکر و نظر اور اسلامی معتقدات اور واجبات حیات کا غلبہ لازمی ہے:

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۝ (سورہ سجدہ آیت ۵)

ایک ہزار کی طویل مدّت میں ۵، ۱۰، ۱۵، ۲۰، ۲۵، ۳۰، ۳۵، ۴۰، ۴۵، ۵۰، ۵۵، ۶۰، ۶۵، ۷۰، ۷۵، ۸۰، ۸۵، ۹۰، ۹۵ — اور ۱۰۰ تک کی مختلف تعمیری اور تخریبی چھوٹی بڑی لہریں اُٹھیں گی۔ جن کا اعتدالی، تخریبی یا تعمیری منتہا ۲۵ اور ۵۰ سال ہوگا۔ مآل کار ایک صدی پر سوچ کر ان کا ابھار منتہائے کمال پر پہنچ جائے گا۔ اسی کے ساتھ ایک نئے تصوّرِ کائنات اور رُوحِ عصری کا آغاز ہوگا یہ نیا دَور تبدیلی کا دَور ہوگا۔ تبدیلیاں اچھی بھی ہو سکتی ہیں اور بُری بھی۔ خواہ کچھ ہی ہو۔ بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے ابھار، نہضتِ جدیدہ اور اس کے عملِ ارتقاء کے تسلسل کو جاری و ساری رکھنے کے لئے ایک نئی تحریک اور ایک نئے محرّک کی ضرورت ہوگی۔ بنا برآں باقتضائے ضروریات زمان و مکان اور واجبات حیات ہر سو سال کے بعد ایک مجدّد آتا رہے گا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک کہ تمام تہذیبیں اور ادیان، اسلام میں ضم نہ ہو جائیں۔ ہر صدی کے خاتمہ پر مجدّد کے آنے

اور اسلام کی رفتارِ ترقی اور فوذ ونفوذ میں نئی حرارت اور برق آسا حرکت کے پیدا ہونے کی بشارت حدیث کے علاوہ سورۂ قدر سے بھی۔ الفِ شہر سے مراد تخمیناً ۸۳ سال ہیں سو سال کی تکمیل کے لئے مزید ۱۷ سال اور درکار ہوں گے۔ نئی صدی کے آغاز اور انقلاب کے آثار و علائم ۸۳ سال کے بعد مکمل طور پہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ پھوڑے کا پک جانا ہے۔ نئی تبدیلی کی بنیاد پہ نئی رُوحِ عصری اور نئی صدی کے برپا ہونے کے لئے مزید ۱۷ سال لگ جاتے ہیں۔ اس مدّت کے فوری پورا ہوتے ہی انقلاب کا آتشی مادّہ کوہ آتش فشاں یا پکّے ہوئے پھوڑے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے۔ سوشیالوجی آف ریولوشن (SOCIALOGY OF REVOLUTION) یعنی عمرانیات انقلاب پر سارو کن نے جو تحقیقاتی کتاب لکھی ہے اُس میں اس نے قرآن کے مندرجہ بالا عمرانی نظریہ کی تصدیق کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر صدی کے خاتمے کے عین ۲۵ اور ۲۰ سال پہلے انقلابی مادّہ پک جاتا ہے اور سو سال ہوتے ہی پھوٹ پڑتا ہے۔ قرآن نے اس مدّت کو کم کر کے ۱۷ سال کر دی ہے۔ تاریخ سے قرآنی تقویم کے صحیح ہونے کا ثبوت چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر انقلابِ روس تک مسلسل ملتا ہے۔ اسلامی وحدت آسا اور انضمامی تہذیب کے درمیان جو کش مکش کا سلسلہ غیر انضمامی عینی اہلِ کتاب کی تہذیب کے ساتھ چلا آتا ہے، اُس کے نتیجے کے طور پہ دو اور تہذیبیں وجود میں آتی ہیں۔ یہ مشرکین یا منکرین اور منافقین کی تہذیبیں ہیں۔ یہ دونوں تہذیبیں اسلام کی انضمامی اور اہلِ کتاب کی عینی تہذیبوں کو دباتی اور مغلوب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ تہذیبیں سراسر حسّی اور لذّتی تہذیبیں ہیں۔ دین سے اگر کوئی تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ اس کو ایک مفروضۂ باطل کے طور پہ تسلیم کیا جاتا ہے اور پھر اُس میں تشتّت، جدل فرپیکار کی بھر مار ہے۔ جہاں تک کثرت کا تعلق ہے اس میں اور اہلِ کتاب کی تہذیب میں کیفیت کی بجائے کمیّت کا فرق ہے۔ اہلِ کتاب کی تہذیبیں ثنویّت اور تثلیث پہ مبنی ہیں۔ اہلِ کتاب کی تہذیب مشرکین اور منافقین کی تہذیبوں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتی۔ تہذیب اور کلچر کے سمندر میں جو چھوٹی لہریں بصورت ذیلی اور طبقاتی کلچر کے اُبھرتی ہیں اگر اس کی اساس کثرت یا دُوئی یا حسّیت اور لذتیت یعنی زن، زر، زمین پر مبنی ہو تو یقیناً یہ منافقین اور مُشرکین یا اہلِ کتاب کی تہذیبیں ختم تو ضرور ہو سکتی ہیں، لیکن اعتدال، استقرار اور جمعیّت وجامعیّت یا تکمل کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ ان واجبات کو حاصل کرنے کے لئے اہلِ کتاب کی طرح مشرکین، منافقین یا ذیلی اور طبقاتی ثقافتو

کے لئے سلے دے کر یہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ سب کے سب اسلام کی امتزاجی اور انضمامی تہذیب میں ختم ہوجائیں۔ سورۂ براءت کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کی متوازی پیشین گوئی بار بار سورۂ بقرہ (۱۶۳) سورہ عمران (۴۷) اور سورۂ اخلاص میں کی گئی ہے۔ دو یا تین یا تین سے اور بھی زائد خداؤں کی تردید کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح خدائے ذوالجلال ایک بلکہ "احد" ہے اُسی طرح دو، تین یا کئی تہذیبیں سوائے اسلام کی ایک تہذیب کے وجود میں تو آسکتی ہیں لیکن فروغ نہیں پاسکتیں ——
(سورۂ النساء ۱۷۱ اور سورۂ نحل ۵۱ ملاحظہ ہو)

تہذیبوں کے مآل کار فنا ہو کر اسلام کی وحدانی تہذیب میں مدغم ہونے کا تصور ابتدائی نفوذِ اسلام سے چلا آرہا ہے۔ علمائے اسلام خواہ وہ کسی مکتبِ خیال یا کسی شعبۂ علمیہ کے خصوصی کیوں نہ ہوں، اسی کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ فارابی، امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن رُشد، ابن باجہ، ابن طفیل، شاہ ولی اللہ، غرضیکہ ہر عالم نے اسی خیال کا اعادہ اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ ابن خلدون نے غلبۂ اسلام کی تاریخی اور عمرانی دلیل پیش کی ہے اور یہ اُس کے نظریات عمرانی و ثقافتی کا ایک فاقد النظیر کارنامہ ہے۔ علماء اور خواص کے علاوہ شعراء، صوفیاء، اُدباء اور عام لوگ بھی اس تخیل سے نا آشنا نہ تھے۔ ظہورِ اسلام اور اس ظہور کے بار بار اعادہ کی پیشین گوئی بہتوں نے کی ہے۔ مثلاً غالب کے اس تصور پر غور فرمائیے ——

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رُسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اہل کتاب کی تہذیبیں ہوں یا منافقین، مشرکین، مرتدین کی یا ذیلی اور دور بدور کی زمانی و مکانی اور طبقاتی تہذیبیں کیوں نہ ہوں سب کے سب بظاہر اسلامی تہذیب اور اس کے نظامِ معنی یعنی توحید کی مخالف ہیں۔ لیکن ان تہذیبوں کے تہ و باطن کا مطالعہ کیا جائے تو بقول قرآن سوائے توحید اور اسلام کے نظامِ معنی کے اور کوئی حقیقت صاف طور پر جھلکیاں لیتے نظر نہ آئے گی۔ اطالیہ کا مشہور عمرانی پیریٹو (PARETO) نے اس حقیقت کا اعتراف آج کر رہا ہے، ظاہر میں کثرتِ خدا بھی ہے، ثنویت اور تثلیث بھی لیکن ان ظاہری حوادثات اور نا مرضیہ احوال کے باوجود بالباطن اصل حقیقت جُوں کی توں موجود رہتی ہے۔ اس خیال کو جو زندگی کا بنیادی وجودی، ہمہ گیر، ہمہ زا اور دائمی سوال ہے، قرآن مختلف اسالیب میں یوں دہراتا ہے:؛

(۱) توحید ہے زندگی کی ظاہر و باطن کی حقیقت، اُسی کا غلبہ ہوگا اور رہتی دُنیا تک باقی رہے گا۔ (بقرہ رکوع ۲۰)

(۲) توحید ہے، دین و مذہب، معاشرت و ثقافت کی بنیادی، وجودی اور دائمی علّت ہے، اسی پر ان سب کے بقا، وجود اور فروغ کا دار و مدار ہے۔ (عمران رکوع ۲)

(۳) اسلام کے غلبے اور حق ہونے کی ہمہ وقتی اور دائمی شہادت اور مرئی و تاریخی ثبوت (عمران رکوع ۱۰)

(۴) کثرت خداؤں کی، بت پرستی اور منافقین کی تردید (عمران رکوع ۱۸، ۲۰ اور ۲۱)

(۵) عیسائیوں کے غلط معتقدات کی تردید (مائدہ رکوع ۱۶)

(۶) وحدت اور خدا کے احد ہونے کے مسلسل اور ان مٹ نقوش فطرتِ انسانی میں۔ (اعراف رکوع ۲۲)

(۷) اسلام اور اسلامی کلچر ہی دنیا میں سربلند اور تمام کلچروں پر غالب، نافذ اور منصور ہوگا۔ (براءت رکوع ۵)

(۸) مدّ و جزر، وقفہ و تعویق، دباؤ اور مخالفت کے باوجود اسلام اور اسلامی کلچر کو مسلسل ترقّی ہی ترقّی ہوتی رہے گی۔ (سورۂ رعد رکوع ۶)

(۹) انسان اور انسانی تہذیبوں کی بے بصری اور حماقت اور ردِّ حق (ابراہیم رکوع ۵)

(۱۰) خدا کی وحدانیّت کا ثبوت کائنات اور مظاہرِ فطرت کے ہر ذرّہ ذرّہ سے۔ (نحل رکوع ۱ تا ۳)

(۱۱) کثرت خداؤں کے ماننے سے فطرتِ انسانی کی بغاوت اور انحراف (نحل رکوع ۷) مزید ملاحظہ ہو۔ عنکبوت، رُوم، یٰسین، فرقان اور رحمان وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ ارتقائی منزل ہو یا انقلابی، وحدت و معنویت سے موافقت اور مکرّر موافقت کے لئے انسانی قافلہ اور معاشرتی نظام ایک قدم پیچھے ہٹ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ خدا کی وحدانیّت اور ذات و صفات میں جب تک انسانیّت جذب نہیں ہو جائے گی جو اسلام کی غایتِ اصلی ہے۔ نوعِ انسانی کا قافلہ یوں ہی ہانپتا کانپتا اُلوہیّت اور اللّٰہیّت کے قریب پہنچتا چلا جائے گا۔ جب اس منزل پر تھکا ماندہ انسان پہنچ جائے گا تو اس وقت اسلام کا ایک نیا ظہور اور اکمل ظہور کا آغاز ہوگا

یہ آغاز و انتہا وہ جنتِ نعیم ہے۔ جس کی بشارت یہ دی گئی ہے کہ مومنین کو خدا کا دیدار نصیب ہوگا۔

قرآن شریف نے عضویاتی، نامیاتی، اور میکانیت کے تمام نظریوں کو مسترد کر دیا ہے۔ ان کے ماسوا قرآن کی رو سے تقسیم اور دُوئی کے نظریے بھی صحیح نہیں ان کا بھی لایعنی قرار دیا جانا ضروری تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام نظریوں کو اس بات کے ماننے سے احتراز ہے کہ انسانی معاشرہ اوّلاً ایک ثقافتی مظہر ہے کیونکہ معاشرت پسندی اور معاشرے میں رہ کر واجباتِ حیات اور واجباتِ شخصیت کی تکمیل کی تمنا بطور روایت نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس تمنا کی تکمیل تجربوں کے واسطے تمام عمر ہوتی رہتی ہے۔ اس کے برقرار اور اُبھارنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ اس لئے قرآن نے تعلیم کو تہذیبی، جمالیاتی اور روحانی جدّ و جُہد کا عامل ترکیبی قرار دیا ہے۔ اسی سے نظامہائے معاشرت اور ثقافت کی شیرازہ بندی اور پھر اُن کا انسانی شخصیت کے ساتھ گہرا ربط بلکہ تقویم ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ماضی سے زیادہ نوعِ انسانی کے لئے کوئی اور عمل تجربات و مشاہدات کے لئے موجود نہیں۔ اس لئے قرآن بار بار تاریخی واقعات کو سمجھنے پر کھنے اور عبرت حاصل کرنے کی دعوت ہے:

—— قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ ——

(الانعام ۱۱) —— صفحۂ قرطاس پر قرآن کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا اور مسلمانوں کے لئے قابلِ عبرت بنا رہے گا کہ نہ صرف قرآن عمرانیات کی اوّلین مستند اور سائنٹیفک کتاب ہے بلکہ یہی وہ کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کو یہ سبق پڑھایا کہ تدوینِ تاریخ اور تاریخ نگاری میں عمرانیات سے کام لیا جانا چاہیئے۔ یہ دونوں علوم آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم اور قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ انسانی معاشرے کی طرح انسان کی مساعی اور تگاپوئے دمادم کے کارناموں کا نام ہے۔ عمرانیات اور تاریخ نگاری گویا انسان کی خودشناسی اور اپنی آپ تعلیم و تربیت کے دو شیون اور بیش بہا مرقع ہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر گہری بصیرت اور دقتِ نظری کے یہ وہ ذرائع اور موجبات ہیں کہ علومِ نظری ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

تاریخ معاشرے کے معاشرتی رجحانات کی ترجمان ہوتی ہے، یہ ایک تاریخی تحقیقات کا وہ قضیۂ اوّلین ہے جس کو فرانسیسی اور انگریز مؤرخین دورِ جدید میں بڑی

شدت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ جرمن تاریخ نگار اس اطمار سے تاریخ نگاری کے فن میں انتہا پر پہنچ گئے ہیں۔ اس حد تک تو ہم ان مفکرین کے تاریخی فکر سے متفق ہیں لیکن یہ کہنا کہ تاریخی واقعات تعینات میں آئیڈلوجی کی تلاش بے سود ہے، ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔ کیونکہ کوئی چیز دنیا میں مقصد کے بغیر اپنے وجود و شہود کو باقی رکھ سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ نگار معاشرے کے اس معنوی ماحول میں جنم لیتا ہے اور پروان چڑھتا ہے جو نظام اقدار کے زیر نگین ہے۔ اسی ماحول سے وہ انسان کے متعلق اس علم معانی کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جو تجرباتی اور آزمودہ ہونے کی وجہ سے حال و مستقبل کی نسلوں کیلئے مفید ہو سکتے ہیں، جس سے وہ ماضی کی قوموں کی غلطیوں اور خطا کاریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اُن کی اساس پر اُس راہِ صواب کو دریافت کر سکتے ہیں، جن پر چل کر وہ فوز اور کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآن نے مطالعہ تاریخ کی جو منہاج مقرر کی ہے اس کو بطورِ نقشہ یوں واضح کیا جا سکتا ہے:

فاعل اور طریقۂ رسائی	انسانی ذہن کی ابوابی تہ	تاریخ کا موضوعِ بحث
	مُدرکات کے جسمانی ذریعے	
	ذہنِ انسانی کی معنوی تہ	
کائناتِ نفس الامری	اشیاء کا علم اور ماہیت، اشیاء کا ادراک، حصولِ علم کا مواد اور ذرائع۔	

اوپر کے نقشے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ نے اپنے دائرہ میں انسان عالمِ نفسی اور روحانی کائنات اور عوالمِ معنی کو شامل کر لیا ہے، اس لئے ان سب کے اجتماع سے تاریخ میں جب تک سروکار نہ رکھا جائے گا، تاریخ اپنے اعیان اور مقاصد، وجود ماہیت کو پورا نہ کر سکے گی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ تاریخ کو عہدِ ماضی کی سرگزشت سمجھتے ہوئے اس ربط اور وجودی تعلق کو نظر انداز کر دیا جائے جو اس کے واسطے حال اور مستقبل پر متعین ہوتا ہے۔ یہ وہ گہرے نقوش ہیں کہ جن کی بنا پر قرآن ایک طرف تاریخ کو علم کا اہم وسیلہ و ذریعہ قرار دیتا ہے (بنی اسرائیل ۲۱، نحل ۴) تو دوسری طرف مسلمان کی شخصیت دین و ایمان کی تکمیل کے لئے اس کو ایک اہم مؤثر قرار دیتا ہے۔ (آل عمران ۱۳۶-۱۳۷) تاریخ کا علم وجودی تعلقات کا تام ہے۔ اس کے ذریعے ان اشکال، ہیئات، اور بدیہات کا علم ہوتا ہے جن کی حیثیت وجودی کل کی ہوگی یا وجودی جزو کی۔ موجود ہستی

تعلّق باہمی نام ہے اس چیز کا جو دوسری صفاتی و وجودی چیز سے قائم ہوتا ہے۔ یہ محض تعلّق نہ تو زمانی ہے، اور نہ تو مکانی یا علّتی بلکہ حقیقی اور واجبی۔ تاریخ کا علم ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ اس کے ذات و صفات سے تعلّق باہمی کے پیدا کرنے سے وہ حاضر و موجود ہو سکتا ہے اور اس طرح وہ انسان، انسان کی معاشرت، ثقافت اور شخصیت کی تعمیر اور باز تعمیر کے لئے مہر راہ ہو سکتا ہے۔

قرآن شریف کے اس مفہوم کو جو تاریخ کی ذات و صفات کی بنیادی کنہ اور علت اوّلین ہے۔ ابن خلدون کے بعد نادانستہ طور پر اگر کسی نے قرار واقعی سمجھا ہے تو وہ شلر (SCHELER) ہے۔ جس نے تاریخ کے قرآنی تصوّر کو جرمانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ ابن خلدون کا یہ اعتماد کہ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ باعتبار وسعت اور تعمّق نظری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ظاہر و باطن کا وہ معنوی نظام نہ دریافت کیا جائے جس کی ترجمان کسی معاشرے اور کسی دور کی تاریخ ہوا کرتی ہے یہ معنی معاشرے میں موجود ہوتے ہیں اور معاشرے کی رفتار زندگی سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ ابن خلدون کے ان افکار کو جو اس نے براہِ راست قرآن سے حاصل کئے ہیں۔ دورِ جدید میں رکرٹ (RICKERT) اور جرمن عمرانی ویبر (WEBER) نے پیش کئے ہیں۔ ابن خلدون کی طرح یہ مفکّر بھی اس بات کے مؤیّد ہیں کہ جس چیز کو ہم تاریخ کے اثرات اور ردِّ اثرات کہتے ہیں وہ اصل میں واقعات نہیں جو ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، بلکہ وہ نظامِ معنی اور منشا و اقدار ہیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر بڑی شدّت اور عصبیت کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاریخ کی یہ معنوی تہ (AXIOLOGIEALLAYER) بلاشبہ انسانی قلب و دماغ پر اثر انداز ہو کر ان میں ایک نیا رُوپ پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن قصصِ انبیاء کے بیان کرنے میں تقویم اور واقعاتِ تاریخ کو بیان کرنے کی بجائے ان عوامل و مؤثرات سے بحث کرتا ہے جو تاریخی واقعات، حادثات اور علّتوں کی معنوی، قدری اور وجودی علّت ہیں۔ اس اندازِ تحلیل کو خود قرآن سائنٹیفک واقعیت (SCIENTIFIC OBJECTIVITY) کے نام سے یاد کرتا ہے۔

قرآن شریف کے سورہ ہائے اعراف، ہود، یوسف، ابراہیم، انبیاء، اور قصص کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ نگار کا کام یہ ہے کہ ہر دور کے نظامِ معنی کے عمل اور ردِّ عمل، سمتِ رفتار، تعمیری اور تخریبی رجحانات کو

دریافت کرے۔ ہر دور کی تاریخ بلا شبہ اپنے احوال، جمعیت، جامعیت، انفرادیت باطنیت اور مافوق الطبعی گہرائی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے ہر دور کی تاریخ کے جائزہ میں دیگر احوال کے ساتھ نظامِ معنی پر توجہ کا مبذول ہونا ضروری ہے تاکہ تاریخ کے اپنے پیش کردہ محک اور مسلک کی مناسبت سے اُن کو جانچا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ ماضی میں تاریخ کا عظیم و محیط رکارڈ کے موجود ہوتے ہوئے بھی ابنِ خلدون دوبارہ تاریخ عالم کو معنویت اور تقدس کی منہاج پر بھر سے لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ مقدمہ اسی ارادے کی تمہید ہے۔ تاریخ عالم قدر معنویت کی اساس پر جانچنے کے لئے رانکے (RANKE) شلّر (SCHELER) اور گوئٹے (GOETHE) کا اصرار ہے کہ ہر دور کی نئی نسل اس کام کو بڑے اہتمام سے انجام دے۔

تاریخ نگاری کا فن جیسا کہ قصصِ قرآنی کے علاوہ مائی نیکے (MEINE-CKE) نے بیان کیا ہے، خود عملِ تاریخ سے اُبھرتا ہے۔ عملِ تاریخ، زندگی کے عملِ تسلسل کا نام ہے۔ عملِ تاریخ کو تہییج و تحریک اور ایک خاص سمت پر بڑھنے کی توفیق زندگی کی بنیادی کش مکش اور حیات بیز، حیات زا اور حیات خیز مقاصد، ایمان و اقدار سے ملتی ہے۔ انہیں کے اندر کھر کر اور متاثر ہو کر تاریخ نگار اضطراراً واقعاتِ تاریخ کے بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ معنوی ارتقاء اور معنوی انقلابات جو تاریخی پس منظر سے برپا ہوتے ہیں۔ اُن سے زندگی کے سطوح کے برابر کرنے ماننے اُفق اور بلندیوں کے ابھارنے میں مدد ملتی رہی ہے۔

آخر میں ہم عمرانیاتِ تاریخ کے ایک اہم متضمنہ کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہوئے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ کے معاشرتی اور معنوی تعینات اس قدر مستحکم اور وقیع و عمیق ہوتے ہیں کہ ان کا ظہور ٹھوس حقائق کے سوا مجردات کے ذریعہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ماسوا ان کے، تاریخ کا ایک اور عمیق و محیط اثر ہے جس سے صرفِ نظر تاریخ نگار اور قاریٔ تاریخ، دونوں کے لئے نہایت ہی مضرت رساں ہے۔ تاریخی کارنامے کتنے ہی محتاط، حقیقی اور ٹکنکی انداز کے کیوں نہ ہوں، اگر اُن کا انحصار کسی فلسفیانہ بنیاد اور مافوق الطبعی گہرائی پر نہ ہو، تو یہ سب کے سب قصۂ پارینہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً زمانے کی ماہیت، مزاج اور مقصد و عین کا متعین کرنا، تاریخ فلسفہ کا وہ اہم داعیہ ہے، جس کو قرآن ہی نے مدلل اللہ

مبرہن انداز میں پیش کیا ہے۔ سورۃ العصر ایک جداگانہ سورۃ ہے، لیکن اس کا تعلق قرآن کی اور سورتوں سے اس قدر گہرا ہے کہ بغیر اس کو سمجھے قرآن کی قدر معنویت، عمرانیت، اور روحانیت کے علاوہ زندگی کے عین و منشا، اس کے تسلسل، کلیت، عمق اور اس کی قدر معنویت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس وقیع و محیط تعلق کے علاوہ اس سورۃ کا تعلق قصص قرآنی اور تاریخی واقعات سے اس قدر گہرا ہے کہ تاریخ کی ہر ظاہر و باطن میں جو زمانی علتیں قدر معنویت کے ساتھ کام کرتی ہیں، انہیں کی توضیح سورۃ العصر نے مختصر مگر مدلل انداز میں کی ہے۔ تاریخ وہ حقیقت ہے جو زمانے کی متنوعہ تصاویر میں ہمیشہ موجود اور مرتعکس رہے گی۔ اس لئے قرآن کی سورۃ کا آغاز "والعصر" یعنی زمانے کی قسم سے ہوتا ہے۔ یہ خود ثبوت ہے زمانے کے مرئی، حقیقی، مشیتی، ہمہ وقت اور زندۂ جاوید حقیقت کا۔ یہ تو کہنا غلط ہے کہ انسان نے سنین ماضیہ سے لے کر آج تک ترقی نہیں کی۔ بلاشبہ انسان ترقی کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکا ہے، لیکن جو متوازن ترقی درکار تھی وہ ترقی آج تک نصیب نہ ہو سکی۔ مادی کلچر میں اس نے بے حد و حساب ترقی ہے لیکن غیر مادی کلچر کے اہم شعبے روحانیت، معرفت ذات، اور معرفت ذات بحت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ وہ منشائے الٰہی پورا نہ ہو سکا، جس کی تکمیل اور رہبری کے لئے ہادی اور مرسل اور مآل کار اسلام آیا۔

قرآن کا مسلک تاریخ اس بات کے واضح کرنے میں ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے کہ صداقت کے مسائل اضافیت میں جو وجودی ربط ہے، وہ ایک حقیقت عظیمہ ہے، جس کے نہ سمجھنے پر ہی انسان بقول سورۃ العصر "لفی خسر" کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ قصص قرآنی سے بلاشبہ ایک بات واضح ہے۔ تاریخی واقعات کے کھوج لگانے میں تحقیقاتی منہاج ہی بجائے خود کافی نہیں۔ تاریخ انسانی معاشرت اور ثقافت کے متعلق جن استنتاجات کو پیش کرتی ہے، ان پر تحقیق کے علاوہ وہ نظر غائر بھی چاہیئے جو انسانی قلب و ذہن کی اندرونی گہرائیوں میں پہنچ جائے۔ نظر غائر کا تعلق ایمان و ایقان سے ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی ذہن و قلب کی گہرائیوں اور رموز و اسرار کو خوردبین کے ذریعہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ نہ ہی اس کا امکان ہے کہ ریڈیائی فلکیات (RADIO ASTRONOMY) کے ذریعہ خدا کو دیکھا جائے۔ تاریخ جو انسان کی اپنی وحی کا نتیجہ ہے، اپنے عمل تسلسل میں نئے واقعات اور حقائق کا انکشاف کرتی

رہے گی۔ منجملہ اور باتوں کے تاریخ کی ایک نمایاں حقیقت وہ ہے جس کو قرآن یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی منزل مقرر کرتے ہوئے، اس منزل تک رسائی کے لئے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ کی تعلیم دیتا ہے۔ رانکے (RANKE) نے بالکل سچ کہا تھا کہ تاریخ کے تمام دور خدا کے قریب ہیں۔ لوکاکس (LUCKAS) نے اس قول کی توضیح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کا مدعا یہ ہے کہ تمام ادوار تاریخ کو ایک ہی سطح سے جانچا جائے۔ یہ توضیح بجائے خود کافی نہیں۔ اس مقولے کو اگر قرآنی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تاریخی ادوار کی انسانی لِم کے علاوہ ایک الٰہی لِم بھی ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ رح دہلوی نے "الٰہی زمان" کے نام سے یاد کیا ہے۔ الٰہی زمان کے یہ مفرات تاریخ ادوار کو زندہ رکھتے ہیں اور انہیں قدرِ معنویت کے زندہ رشتے میں مربوط رکھتے ہیں۔ سورہ ہائے ہمزہ، الفیل، قریش، ماعون، کافرون، لہب، اور فلق عمرانیات اور فلسفہ تاریخ کے اعتبار سے اس قدر اہم اور فاقد المثال سورتیں ہیں کہ اس کا اندازہ انسانی حیطۂ قدرت سے باہر ہے۔ ان سورتوں سے منجملہ اور باتوں کے جو اہم سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ژرف نگاہ اور دُور رس رُخ کا اہم کام یہ ہے کہ اپنے تاریخی تجزیہ میں واقعیت پسندانہ مقولات سے کام لیتے ہوئے یہ بات واضح کر دے کہ انسان کس طرح مکر و فریب، خدعِ نفس، منافقت، کفر و زندقی کی لعنتوں سے نجات پا سکتا ہے۔ ان پر فتح پانے اور کس طرح "کل" کے تعلق باہمی کے سمجھنے کے لئے اُس کی اندرونی گہرائیوں میں انسان گھسے اور کس حد تک ان تک رسائی اور ان سب پر فتح پانے کے امکانات موجود ہیں۔

انسانی فطرت کے ایک ہونے کا دعویٰ ایک مفروضہ اور باطل خیال ہے کیونکہ تاریخ تنوع اور اختلاف کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ ایک دور کے قوانین، معتقدات، طرزِ تعمیر اور طرقِ حیات سب ہی ایک جماعت کی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں، جو ایک خاص دور یا زمانے میں گزری ہے۔ انسانی ذہن و قلب کے متن و مدعا بھی سورہ ہائے محولہ کی رُو سے مختلف و متباین ہوتے ہیں۔ معیارِ حُسن و قبح بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اختلافات اگر حقیقت ہیں تو انسانی فطرت کی وحدت سے انکار کرتے ہوئے ایک طرف قرآن انسان کو "ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ط" کے اوصاف سے مخاطب کرتا ہے، تو دوسری

(بقیہ صفحہ ۱۰۵ پر)

رجسٹر ایل نمبر ۷۳۶۰

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۸	اپریل ۱۹۷۹ء	عدد ۴

مشمولات

		صفحہ
★ تقدیم	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
★ تفسیر سورۂ انفال (نشری تقاریر) ...	,, ,,	۲
★ حقیقت و اقسام شرک (۱۰) ...	,, ,,	۱۸
★ اعجاز قرآن کی توثیق بذریعہ کمپیوٹر ...	غازی عزیر (علی گڑھ : انڈیا)	۲۱
★ سنت رسول کی اہمیت ...	محمد یونس جنجوعہ	۳۱
★ حضرت ابوبکرؓ کا نظام حکومت ...	ظفر اللہ بیگ	۳۷
★ فضائل سیدنا عمر فاروقؓ ...	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۵۸
★ عمرانیات تاریخ ...	ڈاکٹر محمد بشارت علی	۸۱

ناشر و مدیر مسئول :

ڈاکٹر اسرار احمد

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن - لاہور

فون : (852611 - 852683)

طابع : رشید احمد چوہدری — مطبع : مکتبہ جدید پریس - شارع فاطمہ جناح لاہور